قندیلِ فکر



ین اینڈ سنز
ار لاہور (۸)



قندیلِ فکر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل تعداد ۲۰۰۰

قیمت :- ۵/ روپے

پرنٹر:- ملک سراج الدین۔

مطبوعہ:- علمی پرنٹنگ پریس لاہور

مقام اشاعت

ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار

لاہور (۸)

قندیلِ فکر

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین سابق اسپیکر پنجاب اسمبلی کے

خطبات کا مجموعہ

مرتبہ

خلیفہ صلاح الدین

سیکرٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار۔ لاہور (۸)

ترتیب

پیش لفظ

(از جسٹس سجاد احمد جان۔ ھائی کورٹ مغربی پاکستان، لاہور)

غالباً ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے جب میں وکالت کے پیشہ میں ایک نو آموز کی حیثیت سے داخل ہوا تھا کہ مجھے جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب مرحوم سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ مرحوم ان یادگارِ زمانہ بزرگوں میں سے تھے جن کی ذہنی اور فکری سطح عوام تو عوام خواص سے بھی بہت بلند ہوتی ہے، اپنے گرد و پیش سے پوری طرح باخبر، تبحرِ علمی اور متانت فکر کی صفاتِ عالیہ سے متصف اور اپنے سینے میں ایک مخلص اور دردمند مسلمان کا دل رکھنے والے۔

مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہر انسان اور بالخصوص ایک وکیل اگر اپنے پیشہ کو محض روٹی کمانے کی خاطر اختیار کرے تو وہ نہ صرف اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے بلکہ انسانی

قدروں سے یکسر محروم ہو جاتا ہے۔ ان سے میری متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑے حاضر جواب، ذہین اور بیباک انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں بذلہ سنجی بھی پائی جاتی تھی۔ ان کا ایک لطیفہ آج تک ہائی کورٹ کی محفلوں میں بڑے لطف سے دہرایا جاتا ہے جو ان کی صاف گوئی، شگفتہ تنقید اور بے باکی کا پتہ دیتا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک سابق چیف جسٹس صاحب نے دیوانی اپیلوں کی سماعت کے لئے ایسے دو جج صاحبان پر مشتمل ایک خصوصی بنچ مرتب کیا۔ ان میں سے ایک جج کو ثقلِ سماعت کی تکلیف تھی یعنی ذرا اونچا سنتے تھے۔ اور دوسرے صاحب عام شہرت کے مطابق بات سمجھنے میں دیر لگاتے تھے۔ خلیفہ صاحب مرحوم ان دنوں ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ ایک روز انہیں چیف جسٹس صاحب نے انہیں کسی کام کے لئے بلوایا اور ضمناً دریافت کیا کہ اس نئے بنچ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ خلیفہ صاحب نے بیساختہ جواب دیا کہ

"حضور والا! آپ نے بہت عمدہ بنچ بنا دیا ہے۔ جو ہم کہیں گے ایک جج مشکل سے سنے گا اور جو دوسرا جج کہے گا ہم اُسے آسانی سے سمجھ نہیں پائیں گے۔ اس سے بہتر بنچ کونسا ہو سکتا ہے"!

خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا جو ذہن پر نقش ہو چکا تھا بغیر یاد آ گیا۔ اصل مقصد خلیفہ صاحب کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا ہے۔

خلیفہ صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھرپور اور موثر زندگی گزارنے اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی اور اس میں وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے۔ انہوں نے زندگی کے سماجی اور اجتماعی شعبوں پر قابلِ قدر اثرات چھوڑے ہیں، وہ ایک مستند تاریخ دان اور صاحبِ علم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری کا اعزاز جو انہیں پیش کیا گیا ان کی گوناگوں صلاحیتوں اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف تھا۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے اور پرجوش خطیب بھی تھے چنانچہ ملک اور بیرونِ ملک کی اہم مجلسی اور ثقافتی تقریبات پر انہیں صدارت کے لئے مدعو کیا جاتا تھا۔ ان کی مصروف زندگی میں ان تقریبات میں شرکت کے لئے وقت نکالنا بڑا مشکل تھا۔ مگر انہوں نے دعوت دینے والوں کے اصرار سے مجبور ہو کر وقت نکالا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تقریبات میں ان کی مجبورانہ شرکت ایک نعمت ثابت ہوئی کیونکہ اس طرح انہیں حالاتِ حاضرہ پر تبصروں اور اپنے پاکیزہ خیالات کے اظہار کے مواقع ملتے رہے — یہ علمی دستاویز جو آپ کے ہاتھ میں ہے انہیں تقاریر اور خطبات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً خلیفہ صاحب ارشاد فرماتے رہے۔ ان میں آپ کو ایسی انمول باتیں ملیں گی جو آج بھی اتنی ہی درست اور قابلِ قدر ہیں جتنی اس وقت تھیں جب کہی گئی تھیں۔ ان میں ملک وملت کے بعض بیمار پہلوؤں کی درماندگی اور شکستگی

کی حکیمانہ تشخیص اور ان کا علاج مضمر ہے۔ تشخیص بالکل صحیح ہے اس لئے کہ شخص حکیم ماہرِ فن ہونے کے علاوہ دیانتدار بھی ہے اور اپنے دل میں علاجِ امراض کی تڑپ بھی رکھتا ہے۔ مجوزہ علاج آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ مریض کی اپنی ذہنی سطح کیسی ہے اور خلیفہ صاحب کے تجویز کردہ نسخوں کو استعمال کرانے والا کس فکری افق کا مالک ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب میں خلیفہ صاحب مرحوم کی تقریروں کے چند اقتباسات درج کر دوں تاکہ سطور بالا میں میں نے جو دعویٰ کیا ہے وہ محتاجِ ثبوت نہ رہ جائے۔

۲۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو گورنمنٹ کالج کیمبلپور کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ :-

"آج ہر شخص کی زبان پر یہی سوال جاری ہے کہ "پاکستان نے میرے لئے کیا کیا ہے"؟ لیکن یہ سوال شاذو نادر ہی پوچھا جاتا ہے کہ "میں نے پاکستان کے لئے کیا کیا ہے"؟ ہمارے دستور سازوں نے بھی بنیادی حقوق متعین کرنے کے لئے کمیٹیوں کی تشکیل تو کر دی ہے لیکن تعجب ہے کہ پاکستانی شہریت کے بنیادی فرائض وضع کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ اگر زندگی کے ہر مرحلہ پر اور بالخصوص زمانۂ تعلیم کے ہر درجہ میں فرائض کا احساس دلایا جائے

تو ہماری بہت سی ایسی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی جو آئے دن زندگی کے مختلف شعبوں میں سر نکال لیتی ہیں"۔

"کلام پاک میں ارشاد ہے" اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" جس کا مطلب یہ ہے کہ ان بلندیوں پر پہنچنے کے لیے مومن کو اپنے خیالات، اعمال اور کردار میں اپنی عظمت کا احساس ہونا چاہیئے۔ درحقیقت مغرز وہی ہے جو اپنے سارے امور اللہ کو سونپ دے اور زندگی کے نازک ترین مرحلہ پر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے"۔

ہم میں سے کتنے ہیں جن کا اولین سوال آج بھی ہر موقعہ پر یہ نہیں ہوتا کہ پاکستان نے میرے لئے کیا کیا ہے؟ جو حرماں نصیب ہیں ان کو تو چھوڑیئے۔ شاید ان کا شکوہ اس لئے بجا ہو کہ وہ اپنے دیگر ساتھیوں اور ہمعصروں کی ناگہانی دولت سے ششدر اور حیران ہو جاتے ہیں لیکن موخرالذکر بھی تو اسی شکوہ میں ہیں کہ ہمیں کچھ اور کیوں نہیں مل جاتا۔ کسی اور کا پیٹ کاٹ کر کیوں نہ سہی۔ حرص و آز کی اس لپیٹ میں کیا کوئی قوم آبرومندانہ عظمت کے مدارج طے کر سکتی ہے"؟

خلیفہ صاحب مرحوم نے طلباء کی ہڑتالوں کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے

"ایک اور اہم مسئلہ جو آپ کی توجہ کا مستحق ہے طلبا کی روز افزوں بدنظمی کا مسئلہ ہے۔ آج کل کارخانوں کی ہڑتالوں کی طرح طلبا کی

ہڑتالیں بھی عام ہو گئی ہیں۔ صنعتی ہڑتالوں کے پسِ پشت اقتصادی وجوہات کار فرما ہو سکتی ہیں لیکن طلباء کی ہڑتالوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا ذرا سی بات پر مظاہرے واک آوٹ اور ہڑتالیں کر دی جاتی ہیں اور ان کے محرکات میں "مشکل پرچے" سے لے کر سٹاف کے کسی رکن کی برطرفی تک شامل ہیں۔ پھر ان مطالبات کی خاطر طلباء کے متحدہ محاذ قائم کیے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال یقیناً افسوس ناک ہے اور اس کا فوری سدِّباب ضروری ہے لیکن محض تعزیری اقدام اس کا حل نہیں ہے۔ ہمیں علاج تجویز کرنے سے پہلے مرض کی تشخیص کر لینی چاہیئے اور اس سارے معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہیئے تاکہ اس قسم کے افسوسناک واقعات کا اعادہ نہ ہو۔ کیا ہم معمر لوگ اس معاملہ میں بری الذمہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ باہم مجروح معصومیت کا روپ دھارنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ اگر طالب علم کے گھر، سکول اور کالج کا ماحول سازگار ہو اور اس کے سامنے والدین اور اساتذہ کا اسوہ ہو جس میں وہ اپنے فرائض دیانتداری کے ساتھ بجا لا رہے ہوں تو یقیناً اس کا خوشگوار اثر طالب علم کی طبیعت پر بھی ہو گا۔ اور وہ ان کی تقلید کرنے کی کوشش کرے گا۔"

کل پاکستان موتمر تعلیمات اسلامیہ عربیہ کو خطاب کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

"وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اپنا تن، من، دھن سب کچھ قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ جنہیں اپنی ذات کی فکر ہو نہ اپنے اہل و عیال اور نہ اپنے خاندان کی۔ جو ملت اسلامیہ کو اپنا خاندان سمجھیں اور اس کی بھلائی کی راہ میں مٹ جائیں۔"

اسلام کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب تک ملتِ اسلامیہ میں اس قسم کے سرفروش پیدا ہوتے رہے ملت بیضا عروج سے ہمکنار رہی اور یہی وہ نسخہ ہے جو عہد حاضر کے مسلمانوں کو عظمت سے ہم آغوش کرنے کے لئے خلیفہ صاحب مرحوم نے اپنے محولہ بالا خطبے میں تجویز کیا ہے اور اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

؎ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

حقیقی مسلمان اور مومن کی نشانی یہی ہے کہ وہ اپنی ہست و بود کو ملت کی ہست و بود سے الگ تصور نہ کرے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جناب خلیفہ صلاح الدین صاحب نے اپنے ممتاز والد بزرگوار کے خطبات کی تدوین اور اشاعت کا فریضہ انجام دے کر نہ صرف ایک ذاتی فرض سے سبکدوشی حاصل کی ہے بلکہ میری دانست میں ملک اور قوم پر بھی بڑا احسان کیا ہے۔ خلیفہ شجاع الدین جیسے صاحب دِل، صاحب علم اور صاحب فہم ہستی کے زریں اقوال جو کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں قومی الجھنوں میں ہمیشہ مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ میں خلیفہ صلاح الدین صاحب کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجموعہ کے لئے پیش لفظ لکھنے کی دعوت دے کر مجھے ایک بڑی سعادت سے نوازا۔

سجاد احمد جان

مقدمہ

از خلیفہ صلاح الدین

مغربی پاکستان کے سابق گورنر نواب مشتاق احمد خاں صاحب گورمانی نے خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ایک بڑا لطیف نکتہ بیان کیا تھا۔ موصوف نے فرمایا تھا کہ "ایک عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر لوگ اس کے در و بام کی خوبصورتی اور اس کے نقش و نگار کی آب و تاب کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس عمارت کے بلند اور دل آویز کنگروں پر پڑتی ہے اور حیرت و استعجاب کے عالم میں ڈوب جاتی ہے مگر وہ بنیادی اینٹ کسی کو نظر نہیں آتی جس پر یہ عمارت ایستادہ ہوتی ہے۔ خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی حیثیت بھی ہماری ملی تاریخ میں اس بنیادی اینٹ کی ہے جس کی اہمیت آج ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔"

جن لوگوں نے ہماری ملی جدوجہد کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی ترقی کے لئے بڑی مخلصانہ اور انتھک جدوجہد کی۔ انہوں نے نام و نمود سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی عمارت کی بنیادی اینٹ دیکھنے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہے مگر جس پر اس عمارت کی بقا کا دارومدار ہوتا ہے وہ قوم کے خاموش خدمت گذار کی حیثیت سے شب و روز اس کوشش میں مصروف رہے کہ ان کی قوم سربلندی کے اس مقام پر فائز ہو جائے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عملی جدوجہد کے علاوہ تحریری اور تقریری ذریعہ بھی استعمال کیا۔ وہ ہماری درسگاہوں میں تشریف لے گئے۔ ہمارے اساتذہ کے اجتماعات میں شریک ہوئے۔ علمائے دین کی مجالس میں شمولیت فرمائی اور ہر جگہ ایک ہی داستان بیان کی یعنی داستانِ دردِ دل۔

خلیفہ صاحب مرحوم کی یہ داستانِ دردِ دل جو انہوں نے مختلف کالجوں، کانفرنسوں اور علمائے دین کے اجتماعات میں خطبات کی صورت میں بیان فرمائی تھی، آج کتابی صورت میں قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ خلیفہ صاحب کے ان خطبات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم دین، علم تاریخ، علمِ فلسفہ اور علم معاشرت پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ قوموں

کے نشیب و فراز کے تمام مراحل ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ وہ اپنے محسوسات کو دلنشیں انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے سینے میں وہ دل تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے ہمہ وقت مضطرب رہتا تھا۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے ان خطبات میں جن مسائل کو موضوعِ فکر بنایا ہے ان میں عربی زبان اور علومِ اسلامی کی ترویج و تدریس، تاریخ کی روشنی میں حضرت عمرؓ کا مقام، علم تاریخ اور اس کا دائرۂ فکر و بحث، مسلمانوں کی علم دوستی، قرآن کی عظمت و افادیت اور اس کا طریقۂ مطالعہ، معلم اور اس کے مسائل، مسلمان معلمین کی ذمہ داریاں، طلبہ کی ذمہ داریاں، تعلیم کا مقصد اور نصب العین اور اردو زبان کی ترویج ہماری خاص توجہ کے محتاج ہیں۔

خلیفہ صاحب کے ان خطبات کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے لوگ میرے اس خیال سے اتفاق کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ وہ حتی الامکان پیش پا افتادہ چیزوں سے دامن بچاتے تھے۔ دوسروں کے افکار و نظریات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرنا انہیں پسند نہ تھا۔ ان کے پاس سوچنے والا دماغ تھا۔ ان کا اپنا ایک مخصوص اسلوبِ بیان تھا۔ ان کے کچھ خاص نظریات تھے جو انہوں نے سالہا سال کے مشاہدے اور تجربے کے بعد قائم کئے تھے۔

وہ اپنے اسلاف کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر

پہنچے تھے کہ جب تک مسلمان عربی زبان سے کما حقہ واقفیت پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک ان کی رسائی علم دین تک نہیں ہو سکتی اور ان کا ذہنِ رسا اس حقیقت کو پا چکا تھا کہ جب تک مسلمان علمِ دین سے آگاہی حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بدنظمی اور بدکرداری بدستور موجود رہے گی۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف اپنے اس خطبے میں اشارہ کیا ہے جو "کل پاکستان موتمر تعلیمات اسلامیہ عربیہ" کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔

سال ہا سال تک اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام کے نظریۂ حکومت کے متعلق بھی ان کے ذہن میں ایک واضح تصور پیدا ہو چکا تھا وہ مسلمانوں کے لئے اس نظام حکومت کو موزوں ترین نظام سمجھتے تھے جو خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا اور حضرت عمرؓ بن الخطاب جس کی سب سے زیادہ واضح علامت تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں بھی اسی قسم کا نظامِ حکومت قائم ہو۔ یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ صحیح نظامِ معیشت پر ایک مستحکم حکومت کا دارومدار ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب نے اپنے اس خطبے میں جس کا عنوان "عمرِ فاروقؓ" ہے بڑے وزنی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو نظامِ معیشت قائم کیا تھا اسی کی برکت تھی کہ مسلمان ہر فتنے سے محفوظ رہے اور اسلامی حکومت نہ صرف مستحکم ہو گئی بلکہ اس عہد کو آج تاریخِ عالم کا مثالی عہد قرار دیا جاتا ہے

کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ نہ صرف اپنی تاریخ بلکہ اقوامِ عالم کی تاریخ کے نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ نہ ہو کیونکہ یہی وہ علم ہے جو ہمیں عمل تغیر سے آگہی بخشتا ہے۔ اور ان اسباب و عوامل سے باخبر کرتا ہے جو اقوام عالم کی ترقی یا تنزل میں کارفرما ہوتے ہیں۔ خلیفہ شجاع الدین مرحوم اس (UNIVERSAL TRUTH) آفاقی حقیقت کا صحیح ادراک رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "آل پاکستان ہسٹری کانفرنس" سے خطاب کرتے ہوئے اپنی قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ گہری نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس نکتے سے بھی واقف تھے کہ کوئی قوم اس علم سے صحیح رنگ میں اسی وقت فائدہ اٹھا سکتی ہے جب اس کی تاریخ رنگ آمیزی سے پاک ہو اور اس پر سے غلط واقعات کے وہ دبیز پردے اٹھا دیئے جائیں جو متعصب مورخین نے ڈال رکھے ہیں چنانچہ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں انہوں نے تاریخ کے ٹھوس واقعات پیش کرکے ثابت کیا ہے کہ جب کسی بیدار مغز حکمران نے کسی قوم کو اس کے جذبۂ حریت سے محروم کرنا چاہا تو اس کی تاریخ کو مسخ کر دیا اور جب کسی مفکر نے اپنی قوم کو ذہنی پستی اور غلامی کے قعرِ ذلت سے نکالنے کی جدوجہد شروع کرنی چاہی تو سب سے پہلے اپنی قومی تاریخ کی تدوین و ترتیب کی طرف توجہ دی اور اسے صحت مند بنیادوں پر مرتب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے اپنی قوم

کے مورخوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ از سرِ نو مرتب کریں اور تلاش و تحقیق کے بعد اس میں سے وہ روایات نکال دیں جو اسلام دشمن عناصر کے ہاتھوں داخل ہو گئی ہیں اور ہمارے سادہ لوح مورخوں نے انہیں تاریخ کا جزو بنا لیا ہے۔ خلیفہ صاحب کے اس فکر انگیز ارشادِ گرامی سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔

خلیفہ شجاع الدین مرحوم اول و آخر معلم اور ماہرِ تعلیم تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس اور تعلیمی مسائل پر غور و خوض کرتے ہوئے گذرا۔ انہوں نے طلبہ کی نفسیات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان مسائل پر جن آرا کا اظہار کیا ہے ان کی قدر و قیمت سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ خلیفہ صاحب کے خیال میں تعلیم کا مسئلہ ہمارے بنیادی مسائل میں شامل ہے۔ اور ہمیں یہ مسئلہ حل کرنے میں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیئے۔ ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کی خرابیوں پر بھی خلیفہ صاحب کی بڑی گہری نگاہ تھی۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح باخبر تھے کہ ہمارے طلبہ میں سرکشی اور انتشار کی جو افسوسناک کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کا مقدس رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب ان کے تعلق کو تجارتی معاہدے سے زیادہ اور کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے اپنے ان خطبات میں جو انہوں نے اساتذہ اور طلبہ کے مختلف اجتماعات میں

ارشاد فرمائے پر گراں قدر مشورہ دیا کہ جب تک معلم اپنی زندگی کو اسلامی سیرت و کردار کے سانچے میں نہیں ڈھالیں گے وہ طلبہ کی حالت کو بہتر نہیں بنا سکیں گے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ مشورہ بھی نہایت قابلِ قدر ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معلم اپنے فرائض کو دیانت داری اور پوری ذمہ داری سے ادا کریں تو ان کو معاشی الجھنوں سے نجات دلانا بے حد ضروری ہے تاکہ۔۔۔۔۔۔ "مزدورِ دل خوش کند کار بیش" کے مصداق وہ ذوق و شوق اور خوش دلی سے درس و تدریس کا مقدس فریضہ ادا کر سکیں۔

تعلیم کے متعلق خلیفہ صاحب کا یہ نظریہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم کا مقصد دراصل تربیتِ نفس ہے اور جب تک کسی قوم میں تربیتِ نفس کا عمل جاری رہتا ہے وہ قوم اخلاقی لحاظ سے ترقی کے زینے طے کرتی رہتی ہے۔ خلیفہ صاحب کے اس نظریئے کی روشنی میں ہمارے اربابِ حل و عقد کو چاہیئے کہ وہ ایسا نظامِ تعلیم وضع کریں جو ہماری نئی نسل میں تربیتِ نفس کا جوہر پیدا کر سکے۔

جیسا کہ سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی زندگی کا بڑا حصہ علم اور معلمین و متعلمین کی خدمت میں بسر ہوا۔ وہ متعدد مسلم تعلیمی اداروں اور انجمنوں کی روحِ رواں تھے۔ ملک کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکرٹری اور پھر صدر کی

حیثیت سے انہوں نے قوم کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں عملی حصہ لیا۔ گویا تعلیم کا فروغ ان کے مقاصد حیات میں سے ایک بڑا مقصد تھا۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے ۱۹۲۲ء میں (پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی اور نادار مسلم طلباء کی تکمیل تعلیم کا ایک ذریعہ پیدا کیا اور اب یہی ادارہ اپنے مرحوم بانی کے افکارِ عالیہ کو منصہ شہود پر لانے کا اہتمام کر رہا ہے۔

افسوس کہ ان صفحات میں خلیفہ صاحب مرحوم کے پُرمغز و فکر انگیز خطبات پر اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ مرحوم کے ایک ایک خطبے کو لے کر اس کا تجزیہ کرتا اور بتاتا کہ قوم کا یہ خاموش خدمت گذار کتنی وسیع نظر اور کتنے ٹھوس علم کا حامل تھا اور اس کے نظریات کتنے صحت مند تھے۔ مرحوم نے ان خطبات میں علم و حکمت کے جو موتی بکھیرے ہیں کاش ان کی قدر و قیمت کو سمجھا جائے اور اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں انہوں نے فکر کی جو قندیل روشن کی ہے خدا کرے وہ گم کردہ راہ لوگوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہو۔

~~آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں نامور باپ کے نیک نفس بیٹے خلیفہ صلاح الدین صاحب کا کہ موصوف نے اپنے والد گرامی کی اس~~

متاعِ عزیز کو سنبھال کر رکھا اور پھر یہ سرمایہ میرے سپرد کر دیا۔ اس طرح مجھے ان کی عنایت سے ان خطبات کو ترتیب دینے کا اعزاز نصیب ہُوا۔

لاہور — ۳ جنوری ۱۹۶۴ء

یجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھ

یدا کیا اور اس

مسلمانوں کی علم دوستی

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے ۷ مارچ ۱۹۴۳ء کو صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا آئندہ صفحات میں درج کیا جا رہا ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں خلیفہ صاحب مرحوم نے پہلے اردو زبان کی قومی اہمیت پر گفتگو کی ہے اور ہمیں تلقین کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم اردو ہی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائیں۔ اس کے بعد آپ نے طلبہ کی ذہنیت اور حصولِ علم کے اغراض و مقاصد پر بحث کی ہے۔ پھر خلفائے عباسیہ کے عہد کی علم پروری پر روشنی ڈالی ہے اور مسلمانوں کے شوقِ علم اور ذوقِ کتب کی سنہری روایات بیان فرمائی ہیں۔ اس کے بعد طلباء کی رہنمائی فرماتے ہوئے انہیں بتایا ہے کہ علم کا حقیقی مقصد کیا ہونا چاہیئے اور برِ صغیر میں جو حالات رونما ہونے والے ہیں ان میں ہمارے لئے کس قسم کا علم مفید ہوگا۔

مُسلمانوں کی علم دوستی

اگرچہ ایک قانون داں کی حیثیت سے میرے وقت کا ایک بڑا حصہ قانونی مشاغل میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن عدالتی سرگرمیوں کی گہما گہمی اور بحث وجدل کے بعد تعلیمی کاروبار اور علمی زندگی کے سکون وطمانیت کی طرف رجوع کرنا میرے لئے ہمیشہ ایک نہایت روح افزا تجربہ ہوتا ہے اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ قدرت نے مجھے اس بلند ترین روحانی مسرت سے کبھی محروم نہیں رکھا۔ میں اپنے صوبے بالخصوص انجمن حمایت اسلام کی تعلیمی سرگرمیوں میں عملی پہلو سے حصہ لینا اپنا خوشگوار ترین فرض سمجھتا ہوں۔ اس فرض کی انجام دہی کا احساس مجھے اپنے مرحوم ومغفور والد محترم سے ملا ہے اور میں خوش ہوں کہ سالہا سال سے مجھے کسی نہ کسی حد تک ان کے نقش قدم پر چلنے کی

سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

عام طور پر ایسے خطبے انگریزی زبان میں تیار کئے اور پڑھے جاتے ہیں، عجب نہیں کہ آپ بھی مجھ سے انگریزی میں خطبہ سننے کے متوقع ہوں۔ انگریزی کو جو اہمیت ہماری زندگی میں حاصل ہو چکی ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے بھی میں نے ملک کی زبان میں آپ سے خطاب کرنا مناسب سمجھا ہے۔ میرے احساس خودداری کو ٹھیس سی لگتی ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض تعلیمی تقریبوں یا معاشرتی مجلسوں میں جہاں انگریزی زبان کے استعمال کی قطعاً کوئی پابندی نہیں ہوتی ہم بلا وجہ اور بے سبب اس غیر ملکی زبان کو ذریعہ اظہار بنا لیتے ہیں۔ حضرات! ہم اردو سے جو ہماری ملکی و قومی زبان ہے اور جو ہندوستان کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے کس طرح بے نیاز رہ سکتے ہیں؟ اردو کی ہمہ گیری اور ہر دلعزیزی روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ اردو کو یہ امتیازی درجہ کبھی حاصل نہ ہوتا اگر اس میں وہ تمام اوصاف موجود نہ ہوتے جو ایک ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زبان میں پائے جاتے ہیں۔ کوئی قوم اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کی زبان اعلےٰ خیالات کی حامل اور اس کی مخصوص تہذیب اور ثقافتی روایات کی آئینہ دار نہ ہو۔ جہاں تک اعلیٰ خیالات کے اظہار کا تعلق ہے حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اس مسئلے کو حتمی طور پر حل کر دیا ہے۔ اعلیحضرت

حضور نظام کی علم دوستی اور معاشرت نوازی کے صدقے میں علمی و ادبی پہلو سے اس زبان کی اہمیت اور عظمت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ آج سے ربع صدی پہلے اس کی یہ ترقی ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی۔ ریاست بہاول پور کی علم پروری کی روایات اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ میں اردو کے ذریعے سے اپنے ناچیز خیالات آپ حضرات کے گوش گزار کر دوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مثال خواہ بجائے خود کتنی حقیر ہو ایسی بہت سی تقریبوں کے موقع پر اردو زبان کے استعمال کے لیے محرک ثابت ہو گی۔

میرے نوجوان دوستو!

آج کی تقریب ایک مسرت انگیز تقریب ہے۔ آپ کو قدرتی طور پر علم کی سند حاصل کرکے خوشی ہو گی لیکن یہی مسرت انگیز تقریب ہمیں باہمی غور و فکر کا ایک لمحہ بسر کرنے کی تحریک بھی کرتی ہے۔

جو علمی سند آپ لئے جا رہے ہیں اس کا صحیح معنی و مفہوم کیا ہے اور آپ کی تعلیم گاہ نے آپ کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟ مجھے آپ معاف کریں گے اگر میں آغازِ کلام ہی میں تحسین کے بجائے تنقیص کے پہلو پر زیادہ زور دوں ہماری یونیورسٹیاں جس طریقے پر ہمیں تعلیم دے رہی ہیں اس پر کوئی صاحبِ فہم اور صاحبِ فکر شخص اظہارِ اطمینان نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اگر ہم اپنے نفع و نقصان کی میزان لگائیں تو مجھے اندیشہ ہے

کہ ہمیں ایک یاس انگیز صورت حال کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس سلسلے میں مجھے بنگال کے ایک ہم عصر مصوّر کی وہ طنز یاد آتی ہے جو اس نے ایک کارٹون کے ذریعے سے ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم پر کی ہے۔ مصوّر نے اس کارٹون کا نام رکھا ہے "یونیورسٹی کی مشین"۔ ایک بڑا ہال ہے جس میں یہ یونیورسٹی کی مشین نصب ہے۔ نوجوانوں کا ایک انبوہ ہال کے ایک دروازے سے داخل ہو رہا ہے اور دوسرے دروازے سے یہی نوجوان فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک ایک کر کے باہر نکل رہے ہیں لیکن اس "درآمد" اور "برآمد" میں یونیورسٹی کی مشین نے ان نوجوانوں پر قلبِ ماہیت کا جو عمل کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ داخلے کے دروازے پر جو نوجوان کھڑے ہیں وہ سب کے سب چست تنومند اور ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ اشتیاق امید اور ہمت ان کے جسم کی ہر جنبش سے عیاں ہے لیکن ہال میں داخل ہونے کے بعد تعلیمی مشین کا شکنجہ انہیں اس طرح پیس ڈالتا ہے کہ جب وہی نوجوان دوسرے دروازے سے باہر نکلتے ہیں تو ان کی پہلی ذہنی و جسمانی تنومندی تو ایک طرف رہی اُن کے جلیئے کی گولائی تک ایک بے جان چپٹے پن سے بدل جاتی ہے اور وہ اس طرح باہر گرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے کٹے ہوئے مقوّے کے بے رُوح پیکر!

حضرات! یہ تصویر مایوس کن ہے لیکن حقیقتِ حال اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف بھی نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے طریقہ تعلیم میں وہ

کیا فتور ہے جس کے باعث ہماری یونیورسٹیاں وہ نتائج پیدا نہیں کرتیں جن کے حصول کی ہم سب کو آرزو ہے؟ کیوں یہ نہیں ہوتا کہ علم کی روشنی سے ہمارے نوجوان ایک بہتر و بلند تر زندگی بسر کرنے کے قابل بن جائیں اور تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زندگی کا عام معیار بہتر و بلند تر ہوتا چلا جائے؟

یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش میں ہمارا ذہن بہت سی قومی و سیاسی اور اقتصادی و معاشرتی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس مختصر صحبت میں میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تمام اسباب کا تفصیلی اور ترتیب وار جائزہ لے سکوں البتہ آگے چل کر میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنے کی گنجائش ضرور نکالوں گا لیکن گفتگو کی اس منزل پر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے ان نوجوان دوستوں سے کچھ مدد چاہوں جو صرف تحصیلِ علم کی غرض سے یہاں جمع ہیں۔ اگر میرے نوجوان دوست مجھے اس سوال کا جواب دے سکیں کہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے سے ان کی غرض و غایت کیا ہے، تو مجھے اس مسئلے کا کوئی موزوں حل تلاش کرنے میں جو اس وقت زیر بحث ہے کم از کم ایک نقطۂ آغاز ضرور مل سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں اگر ہم موجودہ دور کے ہندوستانی طالب علم کی ذہنیت کا تجزیہ کریں تو دو قسم کی خواہشات اس کی سرگرم زندگی کی تہ میں نظر آئیں گی۔ ایک بہت بڑی اکثریت ان نوجوانوں کی ہے جن کا مطمحِ نظر یونیورسٹی سے کسی خاص امتحان میں محض کامیابی کی سند حاصل کرنا ہے

تاکہ یہ سند ان کے لئے معاش کی مختلف راہوں میں سے کسی ایک کو کھولنے کی ضامن ہو سکے۔ دوسری قسم ان نوجوانوں کی ہے جو ایک بے انتہا محدود اقلیت کا درجہ رکھتے ہیں اس قدر محدود کہ انہیں اقلیت کا نام دینا بھی ایک طرح کا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے سے ان کی غرض یہ ہے کہ ذخائرِ علم سے اپنے دماغوں کو مالامال کریں میرے نوجوان دوست جو یہاں موجود ہیں ان دونوں جماعتوں میں سے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے کسی ایک سے یقیناً تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں مقصد بجائے خود بالکل جائز طور پر کسی انسان کا مطمح نظر ہو سکتے ہیں اور مجھے ان سے پوری ہمدردی ہے۔ جس مطمح نظر کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے اس کا تعلق انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اور دوسرا اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ وہ حیات اور ذہنی شائستگی کی پہلی شرط ہے لیکن مجھے معاف کیا جائے۔ اگر ان دونوں میں سے ہر ایک کی اہمیت و منزلت کا جدا جدا اعتراف کرتے ہوئے میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ نہ تو حصولِ معاش اور نہ سرمایہ معلومات کی فراہمی کوئی ایسا مقصد ہے جو یونیورسٹی کی تعلیم کا جواز ثابت کر سکے۔

سب سے پہلے میں حصول معاش کو اعلیٰ تعلیم کے نصب العین کی حیثیت سے لیتا ہوں۔ اعلیٰ تعلیم سے میری مراد ہے یونیورسٹی کی منزل پر پہنچ کر حاصل کی ہوئی تعلیم جس کے نتیجے کے طور پر ہماری یونیورسٹیاں بی۔ اے یا بی۔ ایس۔ سی

او، ایم، اے یا ایم ایس سی کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ آپ حضرات مجھ سے متفق ہوں گے، اگر میں یہ رائے ظاہر کروں کہ ادب فلسفے یا سائنس میں اعلےٰ ڈگریاں لینے کے بعد ہمارے نوجوانوں کا دفتری ملازمتیں اختیار کر لینا یا کسی مقابلۃً زیادہ نفع بخش کاروبار میں پڑ جانا ان کی زندگی کے پہلے باب کو خود بخود ایک سعی رائیگاں کا عنوان دے دیتا ہے۔

حضرات:- میں نوجوانانِ ملک کو ان کی زندگی کے دورِ اوّل کی اس لاحاصلی پر موردِ الزام قرار نہیں دیتا۔ اگر قصور ہے تو ان حالات کا جو ہمارے ذہین یا با ہمت نوجوانوں کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں چھوڑتے۔ جن نوجوانوں کو اپنی پسند اور فطری صلاحیت کے مطابق ابتدائی یا ثانوی تعلیم کی منزل سے گزرتے ہی کسی مفید صنعت یا سود مند کاروبار میں لگ جانا چاہئیے تھا وہ ملک کی عام اقتصادی بدحالی سے مجبور ہو کر فلسفہ اور سائنس کی ڈگریاں لینے کے لئے چار و ناچار یونیورسٹی کی جھولی میں چلے جاتے ہیں۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کسی سمت انہیں کوئی راہ کھلتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ صرف یونیورسٹی کی وسیع آغوش انہیں کھلتی نظر آتی ہے۔ اور یہیں وہ پناہ لیتے ہیں۔ اس "پناہ" کی اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ جس تعلیم سے انہیں قطعاً کوئی مناسبت نہیں، اس کے حصول میں وہ اپنا وقت روپیہ اور صحت برباد کرتے ہیں۔ گویا شاعری کے

روایتی عاشق کی طرح ان کا عمل اس مصرع پر ہے کہ ؎

ہمارا ابھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

یہ صورت حال بہت دردناک ہے اور کچھ ہی عرصہ پہلے ہم اپنے آپ کو اس کا مداوا کرنے میں بے بس پاتے تھے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ جہاں تک اس اس امرِ خاص کا تعلق ہے مجھے ابھی سے افق پر روشنی کے آثار نظر آ رہے ہیں تو امید ہے کہ آپ مجھے یہ الزام نہ دیں گے کہ مجھے تصویر کا روشن پہلو دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ جنگِ عظیم کے خاتمے پر اس ملک کی صنعتی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوگا بلکہ سچ پوچھے تو اس انقلاب کا عمل ابھی سے شروع ہو چکا ہے۔ بڑی صنعتیں جن سے ہمارا ملک اب تک یکسر محروم تھا ضروریات جنگ کے ماتحت ہمارے بڑے بڑے شہروں میں پہلی مرتبہ جنم لے رہی ہیں اور جنگ کے ختم ہو جانے پر ان ملکی صنعتوں کے فروغ کی توقع ہی نہیں یقین ہے۔ مجھے ہندوستانی سیاسیات کے اس باریک نکتے سے کوئی بحث نہیں ہے کہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم اور امریکہ کے صدرِ جمہوریہ کے "اوقیانوسی منشور" کا اطلاق ہندوستان پر ہوگا یا نہیں، لیکن میں اس بات کو قرینِ قیاس سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کی عالمگیر فتح کی صورت میں بیرونی ملکوں سے ہندوستان کی تجارت زیادہ وسیع اور نفع بخش شکل اختیار کر لے گی صنعت و تجارت

میں لاکھوں بے کار نوجوانوں کی کھپت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے لئے طبعاً ناموزوں ہیں، محض بے بسی کے عالم میں یونیورسٹی کی ڈگریوں کے لئے مارے مارے نہیں پھریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ نوجوان طلبہ کی اس عظیم الشان اکثریت میں جو اعلیٰ تعلیم کو محض حصول معاش کا ذریعہ بناتی ہے، خاتمہ جنگ پر نمایاں کمی ہوگی۔ مجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بہاولپور اور ہندوستان کی قسمت مشترک ہے۔ جس آنے والے صنعتی انقلاب کا تصور قائم کرنے کی کوشش میں نے کی ہے۔ اس سے آپ کا مستفید ہونا بھی اتنا ہی یقینی ہے جتنا برطانوی ہندوستان کا۔

تلاشِ روزگار سے قطع نظر دوسرا نصب العین جو ہمارے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے دنیا کے خزائن علمی سے بہرہ یاب ہونا ہے۔ میں اس مقصد کی بنیادی اہمیت کو پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں لیکن حضرات! صرف دوسروں کی تخلیقاتِ علم و حکمت سے اپنے دماغ کو بھر لینا ہی اگر ہمارا منتہائے مقصود ہو تو ہم اپنے ذہن سے محض ایک مشین شاید ایک اعلیٰ درجے کی مشین کا کام لے کر اپنے جوہر انسانیت کی توہین کر رہے ہیں اگر ہماری تحصیلِ علم ہمیں ایک نئی بصیرت عطا نہیں کرتی۔ ہماری معلومات کے شورزار سے اجتہادِ فکر کے لالہ و گل نہیں پھوٹتے۔ ہمارے سرمایۂ حکمت سے زندگی کے نور کا سرچشمہ نہیں ابل پڑتا تو ہماری مثال زیادہ سے

زیادہ لغت کی ان بھاری بھر کم کتابوں کی سی ہے۔ جن کے اندر بے حس و حرکت الفاظ کے منجمد خزانے بھرے پڑے ہیں لیکن ان میں اتنی سکت نہیں کہ کوئی جاندار فقرہ زبان سے ادا کر کے کسی ایک انسان کے شعور میں تموّج پیدا کر سکیں!

سرمایۂ ذہن کی ثروت اور روح کا افلاس ہمارے نظامِ تعلیم کی سب سے خطرناک بیماری ہے۔ تحصیلِ علم کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں رہی کہ یہ ہمارے حافظے کی وسیع سرگرمی کا دوسرا نام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سرسید، محسن الملک، وقار الملک، حالی، و شبلی جیسی شخصیتیں پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ لیکن حضرات! ہمارے ذخیرۂ علم نے اگر ہماری شخصیت میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا تو ہماری معلومات محض ایک بنجر قطعۂ زمین ہیں جس سے ہمیں کسی پھل کی توقع نہیں ہو سکتی۔ توازن تناسب، اجتہاد، حرکت، یہی فضائل ایک صحیح علمی زندگی کے نصب العین کا درجہ رکھتے ہیں اور انہیں کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی ہستی زیادہ وسیع و فراخ، زیادہ پاکیزہ، زیادہ تابناک بنتی ہے۔ ہمارے لئے یونیورسٹی کی تعلیم کا سب سے بڑا انعام شاندار خیالات کی پیہم رفاقت، شاندار مقاصد کی دائمی تحریک، شاندار کارناموں کی شبانہ روز مثال، اور شاندار ناکامیوں کی ہمیشہ رہنے والی طمانیت ہے۔

مجھے اس بات سے یک گونہ خوشی ہوتی ہے کہ میں آج ایک ایسے شہر میں آپ حضرات سے خطاب کر رہا ہوں جس کا نام ایک مبارک دور کی یاد میں بغدادِ جدید رکھا گیا ہے۔ بغداد جدید کو مدینۃ العلم بغداد سے وہی نسبت ہے جو دولت عباسیہ کو خلافت عباسیہ سے ہے۔ اعلیٰ حضرت حضور فرمانروائے مملکت بہاولپور ایک ایسے خاندان کے نام لیوا ہیں جو اپنی شوکت، اپنے جاہ و جلال، اپنی علم پروری، علم دوستی اور عالمانہ شان کے لحاظ سے دنیا کے مہذب ترین شاہی خاندانوں میں بھی ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ جس طرح یہ کالج اور اس مملکت کے مختلف ادارے حضور کی شاہانہ توجہ سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کا بغداد بھی آپ کے اجداد کی توجہاتِ کریمانہ اور عنایاتِ خسروانہ سے بہرہ یاب ہوتا تھا۔ اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا کہ اطراف عالم سے علم کے شیدائی سینکڑوں ہزاروں میلوں کی مسافت پیادہ پا طے کر کے مدینۃ العلم بغداد کے مدرسوں اور جامعہ نظامیہ اور جامع مستنصریہ کی سی بے نظیر درسگاہوں سے اپنی تشنگی علم بجھانے کی خاطر جوق در جوق چلے آتے تھے، ہر مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ بندہ و آقا، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم کی تمیز کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

جوزف ہیل اپنی مشہور کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے کہ "بغداد میں علم کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ عباسیوں کے دور میں قلمرو کے اطراف و اکناف میں

مدرسوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور شوق علم کی یہ کیفیت تھی کہ کسی قانون کے بغیر ہر کوئی ابتدائی تعلیم چھوڑ، اعلیٰ تعلیم اپنے لئے لازمی سمجھتا تھا۔ جامعات کے قیام سے پہلے ہی ہر بڑی مسجد ایک قسم کی یونیورسٹی بن چکی تھی۔ قرآن، حدیث، فقہ، ادب کے علاوہ علوم دنیوی مثلاً فلسفہ، مابعد الطبیعات، تاریخ، ریاضی وغیرہ بھی اسی توجہ سے پڑھائے جاتے تھے۔ استادوں کا علم، ان کا تبحر، ان کی قادر الکلامی ہی ان کی مقبولیت کی ذمہ دار تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم لیکچر سننے کے لئے آتے کسی کو کوئی فیس ادا نہیں کرنی پڑتی تھی اور ان مجلسوں میں شریک ہونے والے جاہل لوگ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے عالم کشش علم سے مجبور ہو، چشمہ ہائے علم کا پانی جگہ جگہ چکھتے ہوئے اس جگہ پہنچ جاتے اور ان پُرمغز لیکچروں سے فیضان حاصل کرتے ـــ لوگ بیباکی سے سوال پوچھتے۔ بحثیں ہوتیں جواب خاطر خواہ اور مدلل دیئے جاتے اور جو کوئی ان سوالات کا شافی جواب نہ دے سکتا ندامت کے سبب سے شہر چھوڑ دیتا۔"

بعد میں جو جامعات کے قیام کا خیال پیدا ہوا تو اعداد و شمار اکٹھے کئے گئے تاکہ جامعات کے موقع و محل کا انتخاب اسی وسیع پیمانے کے لحاظ سے ہو۔ چنانچہ ایک مشہور عالم یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس دیا تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا۔ ایک اور صاحب علم و فضل سلیمان ابن حرب کے

واسطے بغداد میں قصرِ خلافت کے قریب ایک مرتفع جگہ مثل منبر تیار کی گئی کہ وہاں بیٹھ کر املائے حدیث کریں۔ اسی مجلس میں خلیفہ وقت مامون الرشید اور تمام امرائے خلافت حاضر تھے۔ جو لفظ امام محمدؒ کے منہ سے نکلتا تھا اُسے مامون الرشید اپنے قلم سے لکھتے جاتے۔ جب کل حاضرین کا تخمینہ کیا گیا تو چالیس ہزار نفوس اندازے میں آئے۔

یہ بھی اس زمانے میں وفورِ شوق کی حالت! عباسی جامعات سے قطع نظر ہسپانوی جامعات ہی کو لیجیے۔ قرطبہ کی مشہور جامعہ ایک زمانہ میں یورپ میں سب سے بڑی درسگاہ تھی جہاں اطالیہ اور فرانس اور انگلستان تک سے لوگ طلبِ علم میں آکر اقامت پذیر ہوتے اور برسوں تحصیل علم میں گزار دیتے۔ علم کی فراوانی، عربوں کے کمال اور ان کی زبان وادب کی ترقی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ قرطبہ کا مشہور امیر آلوار عیسائیوں سے شکایت کرتا ہے۔ "میرے بھائیو" وہ کہتا ہے" افسوس کی بات ہے کہ آج ہم عیسائی پڑھتے ہیں تو عربوں کی شاعری اور ان کا ادب، توجہ سے دیکھتے ہیں تو عربوں کی فقہ اور ان کا فلسفہ، اور سیکھتے ہیں تو ان کی زبان، لائبریری اکٹھی کرتے ہیں تو عربی کتب کی اور ستم یہ کہ بولتے ہیں تو عربی زبان اور یہ ان عیسائیوں کی حالت بیان کرتا ہوں جو مسلمانوں کے محکوم نہیں"۔

لطف یہ ہے کہ عباسی جامعات اور اندلسی یونیورسٹیوں کی نقل جب یورپ میں ہوئی اور بولونا، پیڈوا اور پیرس میں جن جامعات کی بنیاد پڑی ان میں بھی

اسلامی درس گاہوں کا سا ہر دیسی پن موجود تھا۔ قرون وسطیٰ کی یورپی جامعات میں بہت دیر تک وہی رواداری اور یکساں برتاؤ کی روایات قائم رہیں جو بغداد اور قرطبہ کی درس گاہوں کا طرۂ امتیاز تھیں اور ان یورپی جامعات میں بھی لوگ ہزاروں کی تعداد میں آ کر شامل ہوتے اور تحصیل علم کرتے۔ مگر افسوس ہماری ہندوستانی جامعات اور ہمارے کالج جو ان یورپی جامعات کی نقل ہیں ان میں نہ علم کی وہ قدر ہے اور نہ طالب علموں میں وہ شوق ہے۔ اس دُہری نقل میں تعلیم اور تعلیم کی روح تقریباً سلب ہو چکی ہے۔

ذرا اس موجودہ زمانے کا عباسی دور سے مقابلہ کیجیے۔ اس زمانے میں جب نہ ریل تھی نہ گاڑی اور عام طالب علموں کو نہ گھوڑا میسر تھا نہ خچر، وفورِ شوق کا یہ عالم تھا کہ آج ہم ان لوگوں کا حال پڑھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ امام رازی اپنی سرگزشت میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے طلب علم میں نو ہزار میل کی مسافت طے کر لی تو میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔ ابن المقری فرماتے ہیں کہ میں نے ایک کتاب یعنی ابن فضالہ کے نسخہ کو حاصل کرنے کی غرض سے ۸۴۰ میل کا سفر اختیار کیا۔ ایک اور بزرگ کا حال سنئے۔ حافظ ابوالخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اولاً تمام ملک ہسپانیہ میں سفر کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر مراکش آئے مراکش اور شمالی افریقہ کے دیگر ممالک کی سیاحت کے بعد مصر پہنچے۔ مصر کے بعد شام، عراق عرب، ایران اور خراسان تک سفر کیا اور یہ سب سفر پیادہ پا طے

کیا۔ یہ تھا علم کا شوق ان لوگوں کو!

اور کتابیں اکٹھی کرنے کی دھن اس سے کم نہ تھی! ان دنوں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ کتابیں لکھنے اور نقل کرنے کی لگن جنون کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ جب بادشاہ علم پرور ہوں تو رعایا کیوں علم دوست نہ ہو اور یہاں تو لوگ علم کے پرستار تھے! خلفا لے وقت خود کتابیں اس طرح جمع کرتے تھے جیسے اور بادشاہ اپنے خزانے میں جواہر کے انبار لگا لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فقط دو مختصر سی مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ حافظ ابن فراط بغدادی نے جب وفات پائی تو کتابوں سے بھرے ہوئے اٹھارہ صندوق چھوڑے اور ان میں بیشتر خود ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، مشہور محدث شیخ ابن جوزی کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی عمر میں دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ ان مثالوں کے پیش نظر کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مامون الرشید کے دارالحکمت میں چار لاکھ کتابیں موجود ہوں!

میں معافی چاہتا ہوں اگر میں نے اس دور کا نقشہ کھینچنے میں طوالت سے کام لیا ہو۔ اس سے میرے مراد فقط یہ تھی کہ آپ کا بغداد جدید اس بغداد کی یاد تازہ کرتا ہے اور دولت عباسیہ بہاول پور اس خلافت عباسیہ کی یادگار ہے جو کسی زمانہ میں علم، ادب، ہنر اور سائنس میں معراج کمال پر تھی۔ اہلِ بغداد کے صنعتی کمال کے متعلق بھی مجھے دو لفظ کہنے کی اجازت دیجئے۔ جوزف ہیل اپنی "تمدن عرب" میں جس کا حوالہ پہلے دے چکا ہوں کہتا ہے کہ "ابتدا میں

شیشہ گری شام سے منسوب تھی مگر عباسیوں کے دور میں بغداد نے شیشہ گری میں وہ کمال پیدا کیا کہ مسجدوں میں شیشے کے قمقمے اور گھروں میں شیشے کے ظروف عام ہو گئے۔ چینیوں نے کاغذ بنایا تو بغدادیوں نے یہ صنعت بھی اپنالی اور ۷۹۵ء میں بغداد نے اپنا کارخانہ کھول لیا اور رفتہ رفتہ تمام قلمرو میں جگہ جگہ کاغذ بنانے کے کارخانے کھل گئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ کاغذ، نرم، ریشمی، رنگدار، چمکیلا، صاف، دانہ دار، غرضکہ بڑھیا، گھٹیا ہر قسم کا کاغذ بہ افراط میسر ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کتابیں اور تعلیم عام ہو گئی۔ مزید براں صنعت و حرفت کا کمال یہ تھا کہ ہر قسم کا ریشمی اور سوتی کپڑا محلہ محلہ میں تیار ہونے لگا یہاں تک کہ گھڑیاں بھی عام ہو گئیں اور خلیفہ ہارون الرشید نے فرانس کے شہنشاہ شارلمین کی طرف اپنا سفیر بھیجا تو تحفہ کے طور پر منجملہ اور نادر اشیاء کے ایک اعلیٰ گھڑی بھی بھیجی جو یورپ میں پہلی گھڑی تھی۔

یہ نعمتیں خلفائے عباسیہ کی علم پروری، روشن دماغی اور مربیانہ سلوک کی مرہونِ منت ہیں۔ اعلیٰ حضرت والئی بہاولپور اسی بے مثل خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی فضیلت اور علم دوستی ہر صاحبِ علم پر روشن ہے ...... اگر مامون الرشید کے زمانے میں بغداد میں چھتیس کتب خانے قائم ہو سکتے تھے اور علم کے چرچے اور لوگوں کے ذوق کی یہ حالت ہو سکتی ہے کہ امام عاصم ابن علی کو املائے حدیث کے واسطے بغداد کی وسیع مسجدوں اور جامعہ نظامیہ کے

کھلے ایوانوں کو چھوڑ کر بغداد سے باہر نخلستان میں درس دینے کے لیئے جانا پڑا کیونکہ حاضرین کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ تھی تو امیدِ غالب ہے کہ بغداد جدید علوم جدیدہ کے اسی گہوارہ میں عنقریب طالب علموں کی ایسی ہی کثرت اور ذوقِ سلیم کی یہی کیفیت ہوگی اور مجھے امید واثق ہے کہ علامہ اقبال کی دعا پوری ہو کر رہے گی۔

ہند میں پیدا ہو پھر عباسیوں کی سرزمیں

حضرات میں اپنا شمار ان لوگوں میں کرنا پسند نہیں کرتا جو ماضی کی پرستش فقط اس لیئے کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہماری قوم بر سر اقتدار تھی اور زمانہ حال کی ہر چیز ان کے نزدیک اس لئے مغضوب ہے کہ ہم دوسروں کے مرہون منت ہیں مگر تاریخ عالم میں اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ علم کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں، نہ اسے قیدی کہا جا سکتا ہے۔ سورج کی تابانی دنیا کے ہر حصہ کو برابر زندگی بخشتی ہے علم ہر قوم اور ہر ملک کے لئے یکساں چراغِ راہ کا کام دے سکتا ہے یہ مانا کہ ماضی قدیم میں یونانیوں جیسی قوم منصۂ شہود پر آئی اور اس کے اذکار و افکار اور کارنامے ماضی کی طویل رات کو اپنی ضو سے اب تک روشن کیئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد عربوں کا اقتدار ہوا تو مہانے عالم میں چین سے ہسپانیہ تک، ایک زبان، ایک تہذیب، ایک ذوق، ایک ہی اصول حیات' اور ایک ہی مطمح نظر کی بدولت عقل انسان کو وہ عروج حاصل ہوا کہ باید و شاید!

مگر چراغ سے چراغ جلتا ہے ! عربوں کے بعد مغربی اقوام کو فروغ ہوا۔ انہوں نے عربوں کے متاعِ علم کو لے کر اسے ترقی دی۔ اب اگر ہم اپنی میراث کو چھوڑ دیں تو یہ ہمارا قصور اور ہمارا ہی نقصان ہوگا۔ مغربی تمدن کا بڑا کارنامہ سائنس کی ترقی ہے اسی تمدن کی بدولت ہمیں خود بہت سی جسمانی آسائشیں میسّر ہیں مگر چونکہ انہوں نے دنیاوی آرام کو اخلاقی اور روحانی مشاغل پر ترجیح دی ہے۔ یہ لازم نہیں آتا کہ ہم خود کسی بری چیز میں ان کی پیروی کریں۔ ہمارا اصول "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ" ہونا چاہیئے۔

ہماری موجودہ تعلیم مغربی طرزِ تعلیم کا غیر تسلی بخش چربہ ضرور ہے۔ اس میں ہمارے ذہن کی وہ نشو و نما نہیں ہو سکتی جس کے ہم حقدار ہیں مگر اس تعلیم سے بھی پوری طرح متمتع نہ ہونا بہت بڑا ظلم ہے مانا کہ اس طریقہ تعلیم میں سطحی پن موجود ہے۔ اس میں علم کے لئے بے غرضانہ اور پرستارانہ جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں مگر یہ ہمارے طریقِ تعلیم اور نصاب کا قصور ہے اگر یہ تعلیم ہمیں اخلاقی لحاظ سے کسی بلند معیار کی طرف نہیں لے جاتی تو ہمیں اپنے اخلاق کی طرف خود توجہ دینی چاہیئے مگر یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ ہر مغربی چیز سے خواہ وہ اچھی ہو یا بری یکسر اجتناب کرلیں۔ موجودہ علوم میں سائنس ہی کو لے لیجئے۔ ہمارے ہاں سائنس کی تعلیم کا معیار کچھ ایسا بلند نہیں۔ اور پھر فارغ تحصیل ہونے کے بعد ہمارے طلبا تلاشِ معاش میں کچھ اس طرح سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی متاعِ علم سے اپنی قوم

کو یا بنی نوع انسان کو وہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو سائنس کی کماحقہٗ تعلیم سے ہونا چاہیئے۔ جن ممالک میں تجربہ گاہیں، معمل اور علمی تحقیق کے ادارے موجود ہیں ان میں آپ بے شمار ایسے طالب علم اور فارغ التحصیل افراد پائیں گے جو اپنے اپنے کام میں مصروف، دنیا و مافیہا سے بے خبر، مگر بنی نوع انسان کے علمی ذخیرے کی افزائش کی دھن میں رات دن کام کرتے رہتے ہیں۔

حضرات! غور کیجئے کس چیز میں ترقی کی گنجائش نہیں؟ کیا ہمارا کھانا طب کے بہترین اصولوں کے ماتحت پکتا ہے؟ کیا ہماری خوراک میں غذائیت کے وہ تمام جوہر پوری نسبت سے موجود ہوتے ہیں جس طرح وہ ہونے چاہئیں؟ کیا ہمیں آسائش کے تمام ذرائع پر قدرت حاصل ہے؟ کیا عقل انسانی نے تمام ممکن اور مفید معلومات حاصل کر لی ہیں جس کے ہم متمنی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں دیکھئے کیا ہو رہا ہے۔ آپ کی اجازت سے فقط ایک ایسی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جو حیرت انگیز ہونے کے علاوہ کارآمد بھی ہے۔ حال کے سائنسدانوں نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جسے وہ "پیشین گو" کہتے ہیں۔ یہ آلہ سمندری مدوجزر کا حساب ایسا ٹھیک لگاتا ہے کہ عقل گم ہو جاتی ہے۔ ریاست ہائے امریکہ کے پایۂ تخت واشنگٹن کے "ادارۂ تجارت" میں یہ آلہ نصب ہے اور اس آلہ کی مدد سے ریاست ہائے متحدہ کے سواحل کے سینکڑوں مقامات کی نسبت یہ آلہ صحیح پیشگوئی کر دیتا ہے کہ ان مقامات پر فلاں دن، فلاں وقت مدوجزر

کی یہ حالت ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ اس مشین کو الٹا چلایا جائے تو وہ گذشتہ پچاس سال کی ساحلی کیفیت اور مد و جزر کی حالت کا ٹھیک پتہ دیتی ہے۔

یہ ایک زندہ ملک کے زندہ دل لوگوں کی مصروفیتوں کا ذکر ہے۔ کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ ہمارے جواں ہمت طالب علم اس نقطۂ نگاہ سے علم کی طرف رجوع کریں گے اور معلومات انسانی میں اضافہ کرنے کی اس طرح فکر کریں گے جو ہر زندہ قوم کو کرنی چاہیئے! یہ کہنا کہ سائنس ہمیں تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے کچھ ایسی معقول بات نہیں، سائنس کی معلومات بے شک ہمیں طاقت ور بنا دیتی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس طاقت سے کیا کام لیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو کام اس طاقت سے یورپ کی اقوام لے رہی ہیں، ایشیا کی قومیں بھی لازمی اور بدیہی طور پر اس سے یہی کام لیں گی۔

علم کی کاغذی سند سے تو اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے فلاں امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا ہے لیکن سب سے بڑا اور مشکل امتحان تو آپ کو اب دینا ہوگا۔ یہ امتحان ہے محنت و مشقت کا، سادگی اور جفاکشی کا۔ سچائی اور راست بازی کا، ایثار و استقلال کا، ہمدردی و رواداری کا۔ محبت اور اخوت کا، اخلاق و اخلاص کا۔ ٹھوس حقائق کی اس دنیا میں کوئی شخص خواہ وہ کسی رتبے یا درجے کا ہو اس امتحان سے نہیں بچ سکتا۔ جو نوجوان اس

امتحان میں ناکام رہتے ہیں انہیں ادنے درجے کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

آپ کی اس آزمائش گاہ کو جسے دنیا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کوئی اسے عالم مجاز کہتا ہے اور کوئی اسے دنیائے دوں! یہ آپ پر منحصر ہوگا کہ آپ اسے کیا بنائیں کیونکہ دنیا انسان ہی کی تخلیق ہے۔ اگر ہم بہیمیت سے کام لے کر دنیا میں قتل وغارت، ظلم وستم، کذب وافترا، تنگ دلی اور کم ظرفی، خود غرضی اور مکاری سے کام لیتے رہیں گے تو یقیناً یہ دنیا دنیائے دوں ہی نہیں بلکہ جہنم سے بھی بدتر ہو سکتی ہے۔ مگر حضرات! یہ جان لیجئے کہ آپ تعلیم یافتہ ہیں اور علم عبادت ہوتا ہے روشنی سے! آپ گویا قوم وملک بلکہ تمام عالم کے لئے مشعلِ ہدایت بن سکتے ہیں اور اپنے اخلاق، اپنے اطوار، اپنے حسن سلوک، اپنی شائستگی سے اپنے ہم نشینوں کو تہذیب کا وہ سبق دے سکتے ہیں جو ہمیں اخلاقی ترقی کی شاہراہ پر کئی منزل آگے لے جائے گا۔

دنیا میں جس قدر بڑے آدمی گزرے ہیں ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے آپ پر یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ خطرات اور مشکلات کی مہیب تاریکی میں جس شے نے ان کو ثابت قدم رکھا اور منزل مقصود تک پہنچایا وہ ان کی سیرت تھی۔ وہ ایسی زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے کہ دنیا کے حوادث ان کے غیر متزلزل عزم پر مطلق اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔

اگر آپ نے قوموں کے عروج وزوال کی داستان پڑھی ہے تو آپ

پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اس معاملے سے انسان کی شخصیت اور سیرت کا ایک گہرا تعلق ہوتا ہے دنیا کے مصلح اعظم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کے قبائل میں دنیا جہان کی خرابیاں اور کمزوریاں موجود تھیں لیکن جب حضورؐ نے اصلاح کا علم بلند کیا اور اس راہ میں زہرہ گداز سختیاں اور مصیبتیں برداشت کیں تو حق نے آپ کو ایسی فتح و نصرت عطا کی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ دوسرے ادیان کے پیشواؤں نے بھی کم و بیش اسی طرح کامیابی حاصل کی۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی جن لوگوں نے اپنی تحقیق اور ایجاد سے علوم و فنون کو ترقی دی ہے انہیں پہلے ناکامی اور مایوسی کی منزلیں طے کرنی پڑیں۔

مشکلات اور خطرات کے ذکر سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ میں آپ کے حوصلوں کو پست کروں بلکہ میں آپ کو زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا اور غیر متزلزل عزم و استقلال کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھانے کی ترغیب دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں علم کے طالب رہے ہیں تو زندگی کے نئے دور میں آپ کو عمل کا طالب رہنا چاہیئے کہ اسی پر آپ کے درخشاں مستقبل کا انحصار ہے۔

مُسلمان معلمین کے مسائل

۲۷ فروری ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم ٹیچرز فیڈریشن کے زیر اہتمام ایک کانفرنس منعقدہ جالندھر سے خطاب کرتے ہوئے خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمان معلمین کو بعض بڑے مفید مشورے دیئے تھے جو آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ اس خطبۂ صدارت کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ جب تک معلّم خود صاحب کردار نہیں ہوگا اس کے زیر تعلیم تلامذہ سے کسی اچھے کردار کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس وقت تک اچھے معلّم پیدا نہیں ہوسکتے جب تک ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں کی جاتیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مسلمان معلمین کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی طرف خاص توجہ دیں اور اپنے شاگردوں سے صرف اردو میں گفتگو کریں۔

مسلمان معلّمین کے مسائل

یہ ایک عام رسم ہوگئی ہے کہ اس قسم کے سالانہ اجتماعات کے لئے کوئی شخص صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ کرسی صدارت پر بیٹھنے کے بعد وہ اپنا خطبہ سناتا ہے۔ خطبہ سنانے اور صدارت کے دوسرے فرائض انجام دینے کے بعد وہ آپ سے رخصت ہوجاتا ہے۔ مگر ملّتِ اسلامیہ کے اہم ترین مفاد کے پیش نظر میں اس رسم کو ایک خاص اہمیت دینا چاہتا ہوں۔ میں جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کرنے والا ہوں وہ محض ایک رسم کا اعادہ ہی نہیں ہے بلکہ میری خواہش ہے کہ ہم جب اس جلسہ گاہ سے رخصت ہوں تو اپنے ساتھ ایک عزم لے کر جائیں۔ ایسا عزم جو زندگی کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کرکے ایک نئی تعمیر کی داغ بیل ڈال دے۔

آپ کی جماعت کا نام "مسلم ٹیچرز فیڈریشن" ہے۔ میں
اس نام کے تین حصوں میں جزو اوّل کو سب سے زیادہ اہم اور قابل تعظیم سمجھتا
ہوں۔ یہ انجمن فیڈریشن ہے مسلمان کی اور اسی لحاظ سے اس کی تنظیم و اتحاد کی
بنیاد محض وہ اصول ہرگز نہیں ہو سکتے جن پر کسی بیوپار سبھا یا ٹریڈ یونین کا اتحاد
قائم ہوتا ہے۔ آپ کی انجمن کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ اساتذہ کے دنیوی
مفاد اور "حقوق" کی نگہداشت کریں۔ اس فیڈریشن کا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے
کہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں علم و عمل کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز
کیا جائے تا کہ آپ کے درس و تدریس سے جو نوجوان فارغ التحصیل ہو کر
نکلیں ان کا سب سے پہلا فخر یہ ہو کہ مسلم اساتذہ کے مسلم شاگرد ہیں۔ جن نازک
حالات اور انقلاب آفریں تغیّرات میں سے آپ گزر رہے ہیں۔ ان کے دُور رس
نتائج کے پیش نظر آپ کے لئے لازم ہے کہ آپ اپنے نصب العین کو
بحیثیت مسلم اساتذہ کے واضح طور پر معین کریں اور اپنی تمام بکھری ہوئی سرگرمیوں
کو صرف ایک مرکز پر لے آئیں۔ آپ کی اس فیڈریشن کا وجود بہت مبارک ہوگا،
اگر قومی ضروریات اور بالخصوص تعلیمی مفاد کے مقتضیات کے ماتحت آپ
اتحادِ عمل کا ثبوت دیں اور اپنے قائم کردہ نصب العین تک پہنچنے کے لئے
نئی نئی راہیں تلاش کر سکیں۔ آپ کی یہ فیڈریشن محض ایک مجلس مشاورت ہی
نہیں بلکہ ایک مجلسِ عمل بھی ہونی چاہیئے۔ اساتذہ کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے،

کیونکہ دراصل وہی آنے والی نسلوں کو نئے اور بہتر سانچوں میں ڈھالتے ہیں اس لحاظ سے جہاں آپ کا فخر بہت بڑا فخر ہے وہاں آپ کی ذمہ داری بھی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اسے محض ایک اتفاق سمجھئے یا زمانے کی نیرنگی کہ دنیوی نعمتوں میں اساتذہ کا حصہ وہ نہیں ہے جو ان عظیم ذمہ داریوں کے پیش نظر ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ اقتصادی پہلو سے معلمین کی حالت اس دنیا میں قابل رشک نہیں ہے اور شاید کبھی قابل رشک نہیں ہوئی۔ لیکن کیا ان کی زندگی کا یہی پہلو انہیں زیادہ صاحب عظمت اور قابل احترام نہیں بناتا؟ میرے نزدیک اچھے اساتذہ و معلمین کا درجہ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت ارفع و اعلیٰ ہے جو صرف اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے ہیں۔

بایں ہمہ کوئی انسان خواہ اخلاق و دماغ کی صلاحیتوں میں اس کا مرتبہ کتنا بلند ہو، اپنی زندگی کے مادی پہلوؤں کی فلاح سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اساتذہ سے کام لیتے ہیں ان پر اساتذہ کو ضروریات زندگی اور آرام و اطمینان کے وسائل بہم پہنچانے کی ذمہ داری یقیناً عائد ہوتی ہے۔ کم از کم زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے بارے میں اساتذہ کی تشفی ہونی چاہیئے۔ اگر ان کے دماغ افکار معیشت میں مبتلا رہیں تو وہ اس قابل نہیں ہو سکتے کہ ان بہترین توقعات کو پورا کریں جو اپنے بچوں اور آئندہ

نسلوں کے متعلق ہم نے ان سے وابستہ کی ہیں ان کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ احساسِ کمتری جو احتیاج و افلاس کی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ علم و عمل کی تمام قوتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ ہمارے اساتذہ کا معیارِ زیست اس حد سے نیچے کبھی نہیں جانا چاہیئے جہاں پہنچکر اعتمادِ نفس کو قائم رکھنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اس اعتمادِ نفس کے بغیر انسان کو زندگی کے کسی شعبے میں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ تعلیم و تدریس کے شعبے پر بھی یہی اصول نافذ ہوتا ہے۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی اسقدر گراں ہو گئی ہیں کہ لوگوں کو روح اور جسم کا اتحاد قائم رکھنے کے لیئے شدید دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی حالت میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اساتذہ کے لیئے معقول گرانی الاؤنس کا انتظام کرے تاکہ وہ بہ اطمینانِ قلب اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ حکومت نے تمام سرکاری ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ مدارس کے لیئے گرانی الاؤنس منظور کیا۔ لیکن فرقہ وار مدارس اس امداد سے محروم ہیں۔ مسلمان مدارس اس معاملے میں خاص توجہ اور مدد کے مستحق ہیں کیونکہ ان کی مالیات کی کیفیت عام حالات میں بھی دوسری اقوام کے مدارس کے مقابلے میں بہت کم قابل اطمینان ہوتی ہے اکثر مسلمان اداروں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ استادوں کی تنخواہ میں کسی قسم کا اضافہ کر سکیں۔ اس سے دلوں میں

مایوسی اور بے چینی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ ہر تعلیمی ادارے کو یہ حکیمانہ مقولہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ع

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

حضرات! ان اقتصادی مشکلات کا احساس رکھنے کے باوجود جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ جو اہم مسائل اس وقت ہماری توجہ کے محتاج ہیں ان میں سب سے نمایاں حیثیت اقتصادی مسئلے کی نہیں بلکہ ایک اور مسئلے کی ہے۔ میرے نزدیک اس کانفرنس کی فکر و توجہ کا موضوع مسلمان معلّم ہے۔

مسلمان معلّم کی روایات کیا ہیں؟ اس کے موجودہ حالات کو اس کی روایات سے کیا تعلق ہے اور مستقبل کے امکانات کیا ہیں؟ یہ ہیں وہ مسائل جن پر ہمیں غور کرنا ہے۔ ہمیں مسلمان معلمین کے خاص کمالات اور امتیازی خصوصیات، ان کے دائرہ عمل اور سب سے بڑھ کر ان کے اس اثر پر ایک غائر نظر ڈالنی چاہیئے جو ان کی تعلیم سے ان کے شاگردوں کی طبائع پر پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں بیجا نہ ہوگا اگر ہم اپنے شاندار ماضی پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں اور اسلام کے نظامِ معاشرت میں استاد کا بلند درجہ پہچاننے کی کوشش کریں۔ دنیا کے مصلح اعظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے علم کا حاصل کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

علم حاصل کرنے کے لئے تمہیں چین بھی جانا پڑے تو جاؤ" حضورؐ کی علم دوستی اور روشن خیالی کی اس سے درخشاں مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو غیر مسلم چینیوں سے جو اس وقت علوم و فنون کے ماہر تھے علم حاصل کرنے کے لئے سفر کی صعوبتیں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ اسی ارشاد کا نتیجہ تھا کہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں علماء فضلاء کے حلقہ ہائے درس قائم ہو گئے اور علم کے طالب سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے درس میں شامل ہونے لگے۔ علمی تحقیق۔ تبحر اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے علماء اسلام کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے سلطان اور خلفاء ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

امام مالکؒ نے حضرت سعید بن المسیبؒ تابعی سے روایت کی ہے کہ "میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پیادہ پا چلا ہوں" صحیح بخاری کے مصنف امام بخاریؒ نے چودہ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک اس عالی مقام امام کے سفر کی فہرست میں ہیں۔ امام ابو حاتم رازیؒ کے علمی ذوق اور تحقیق کا یہ حال تھا کہ انہوں نے نو ہزار میل سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی۔ یہ ان کی سیاحت کی انتہا نہیں بلکہ شمار کی حد ہے کیونکہ امام ممدوح فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔ امام نضر بن شمیلؒ نے چالیس صرف مختلف قبائل کی زبانوں

کی تحقیقات کی خاطر صحرا کے عرب میں بسر کردیئے۔ حکیم ابونصر فارابیؒ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس قدر تہیدست تھے کہ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتے۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کردیا۔ تالیف و تصنیف میں کمال کی یہ کیفیت تھی کہ سبط ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا شیخ ابن جوزیؒ کو ایک بار سرِ منبر یہ کہتے سنا کہ میں نے اپنی انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ جن قلموں سے انہوں نے حدیث شریف کی کتابیں لکھی تھیں ان کا تراشہ جمع کرتے گئے۔ جب وفات پانے لگے تو وصیت کی کہ غسل کا پانی اسی تراشے سے گرم کیا جائے چنانچہ ان کے غسل کا پانی اسی پاک ایندھن سے گرم ہوا۔

اخلاقی معیار سے بھی ہمارے پرانے علماء کا پایہ بہت بلند تھا۔ امام اعظمؒ امام مالکؒ سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبع میں عالی۔ لیکن جب ان سے ملے تو اس ادب سے ملے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ ان کے دل تعصب اور رقابت کے ناپاک اثر سے بالکل صاف تھے۔ وہ دوسروں کے کمالات کا خواہ وہ ان کے معاصر اور حریف ہی ہوں، فراخ دلی سے اعتراف کرتے تھے۔ حق گوئی اور انصاف کا عَلَم بلند رکھنے کے لئے وہ بادشاہوں کی ہیبت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک دفعہ سلطان سلیم خاں جو سلاطین

عثمانیہ میں بڑے جلال و جبروت کا بادشاہ گزرا ہے خزانے کے ملازموں پر اس قدر ناراض ہوا کہ ان میں سے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ مولانا علاؤالدین جمالی قسطنطنیہ کے مفتی تھے۔ انہیں ان ملازموں پر رحم آیا اور سلطان کو سمجھانے کے لئے باب عالی تشریف لے گئے۔ حضور سلطانی میں اطلاع ہوئی تو اجازت ملی کہ تنہا آئیں۔ سلام کر کے بیٹھ گئے تو سلسلۂ تقریر یوں شروع کیا "جو علماء منصبِ فتویٰ رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ سلطانِ وقت کی آخرت درست رکھنے کی فکر رکھیں۔ میں نے سنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے حالانکہ شرعاً یہ ناجائز ہے۔ لہٰذا میں عفوِ سلطانی کی استدعا کرتا ہوں" سلطان نے قہر آلود ہو کر کہا کہ "تم کو حدِ اختیار سے بڑھنا اور امور سلطنت میں دخل نہیں دینا چاہیئے"۔ جواب دیا میں معاملات سلطنت میں دخل نہیں دیتا۔ میں عاقبت سلطانی کی عافیت چاہتا ہوں۔ سلطان پر ان لفظوں کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف اس کا غصہ فرو ہو گیا اور سب کی خطائیں معاف کر دیں بلکہ مفتی کی خواہش کے مطابق انہیں پھر ان کے اپنے عہدوں پر بحال کر دیا۔

ہمارے پرانے علماء علمی کمالات کے ساتھ سپاہیانہ اوصاف کے بھی مالک تھے۔ امام شافعیؒ تیراندازی میں اس قدر مشاق تھے کہ بہت کم تیر خطا جاتے تھے۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے معلم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اتباع میں اپنے کام کو خود سرانجام دیتے تھے۔ ابوالاسود نحویؒ

پر آخیر عمر میں فالج گرا۔ ان کی عمر اناسی برس کی تھی۔ فالج کے اثر کی وجہ سے ہاتھ پاؤں بیکار ہو گئے تھے مگر پھر بھی پاؤں گھسیٹتے ہوئے بازار کو جاتے اور سودا سلف لاتے۔ حالانکہ وہ آسودہ حال تھے اور ان کے پاس بہت سے خادم تھے۔ ایک روز ایک واقف نے دریافت کیا کہ آپ اس قدر خادموں کے ہوتے ہوئے یہ شاقہ محنت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ اس معمرّ عالم نے بے مثل جواب دیا کہ اس آمد و شد میں اتنا نفع ہے کہ جب میں گھر میں لوٹ کر آتا ہوں تو لڑکے بھی کہتے ہیں آ گئے۔ لونڈیاں بھی کہتی ہیں آ گئے۔ اگر گھر میں پا شکستہ ہو کر پڑ رہوں تو بکریاں مجھ پر پیشاب بھی کریں تو کسی کو خبر نہ ہو۔

یہ ہیں چند مثالیں علماء سلف کے ذوقِ علم و عمل کی — آج کتابوں اور مدرسوں کی کثرت اور نقل و حرکت میں حیرت انگیز سہولتوں کے باوجود کتنے مسلمان ایسے ہیں جو علمی ذوق میں علماء سلف کا مقابلہ کر سکیں وہ افلاس اور دنیاوی پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود علم حاصل کرنا اور علم پھیلانا اپنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔ علمائے سلف کے یہ تحیّر خیز اور درخشاں کارنامے دورِ حاضر کے مسلم اساتذہ کے لئے ایک ایسا روشن اور روح افزا سبق ہیں جن میں ان کی ترقی اور کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ یاد رکھئے انہیں کبھی عظمت و شہرتِ دوام نصیب نہ ہوتی اگر ان کی سیرت

ہونا چاہیے کہ وہ نہ صرف پورے خلوص سے اسلام کے ارکان بجا لائے بلکہ مذہبی تعلیم کی اشاعت میں اس طرح دلچسپی لے جس طرح علمائے سلف لیا کرتے تھے۔ مذہب سوسائٹی کے نظام کو مستحکم کرنے کے لئے بنیادِ آہن کا حکم رکھتا ہے۔ کسی مسلمان کا وجود سوسائٹی کے لئے اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اسلامی تعلیمات سے پورے طور بہرہ ور نہ ہو۔ مسلمان استاد محض معلم ہی نہیں بلکہ مبلغ بھی ہے وہ تبلیغ کے فرائض صرف اسی صورت میں بطریق احسن انجام دے سکتا ہے۔ جب وہ دنیا کے سب سے بڑے مبلغ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے نقش قدم پر چلنا اپنا اہم ترین فرض سمجھے۔ اسلام ہماری دینی اور دنیاوی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔

حضرات! میں اس امر کی طرف آپ کو خاص طور پر توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ اپنی گراں بار ذمہ داریوں سے اس وقت تک سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ آپ کے شاگرد آپ کے علم و فضل سے پورے طور پر متمتع نہ ہوں۔ نوجوانوں کے حقیقی لیڈر اور رہنما آپ ہی ہیں کیونکہ آپ کی رہنمائی کے بغیر نہ تو وہ زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور نہ ان میں زندگی کی مشکلات پر غالب آنے کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ دیکھنا آپ کا خاص کام ہے کہ نوجوان صحیح راستے پر چل رہے ہیں اور وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک تو نہیں گئے؟ آپ کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ آپ کے

ہیں کڑی سے کڑی آزمائش میں پورا اترنے اور ہر مفید تحریک میں سب سے پہلے قدم اٹھانے کی صلاحیت موجود نہ ہوتی۔ وہ زبانی جمع خرچ کے بجائے مثال قائم کرنے کے زیادہ قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو بات ان کے منہ سے نکلتی تھی وہ بطور سند پیش کی جاتی تھی۔

استاد کا کام صرف یہی نہیں کہ اپنے شاگردوں کو کتابی تعلیم دے کر امتحان پاس کرنے کے قابل بنا دے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے حسن عمل سے ان کی سیرت میں ایسا جوہر پیدا کرے کہ ان کی شخصیت ملت کے لئے سرمایۂ نازش ہو۔ تعلیم کی غایت ہی یہ ہے کہ استاد کے علم و عمل اور اس کی سیرت کے اثر کی بدولت نوعمر شاگرد میں ایسی خوبیاں پیدا ہو جائیں کہ وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے ایک کامیاب اور مفید زندگی بسر کر سکے۔ ایسی زندگی بسر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کیریکٹر کے اعتبار سے اس کا پایہ بلند ہو۔ ذاتی اغراض پر مفادِ عامہ کو نہ صرف ترجیح دیتا ہو بلکہ ضرورت کے وقت ان کی حفاظت کے لئے قربانی کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

حضرات! ہم اس الناک حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے نوجوان مذہب سے زیادہ بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس بیگانگی کی ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ مسلمان استاد کا اولین فرض یہ

شاگردوں میں زندگی کی جدوجہد اور اس کی عظیم الشان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ اس اہم فرض کو بجا لانے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ آپ کے پاس بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری ہو، بلکہ آپ کے پاس وہ خاص علم ہونا چاہیئے جو اسلام کی تاریخ اور اس کے فلسفے کے گہرے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کا جس قدر وقت کام سے بچتا ہے وہ علم کے حصول میں صرف ہونا چاہیئے۔ اس غرض کے لئے آپ علمی مجلسیں قائم کیجئے۔ جن میں علمی مباحثے ہو سکتے ہیں۔ اخبارات کا مطالعہ کیجئے اور لائبریری کی کتابوں سے اپنی معلومات کو بڑھائیے۔ اس امر کا خیال رکھیے کہ آپ کی سرگرمی اور مستعدی زمانے کی رفتار کے مطابق ہو۔ آپ کو "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر سختی کے ساتھ کاربند ہونا چاہیئے۔ نوجوانوں کی سیرت کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کیجئے کہ وہ جنگ کے بعد دنیا میں ایک کامیاب اور معزز شہری کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔ جنگ کے بعد ہمارے تعلیمی نظام میں لازمی طور پر تبدیلی پیدا ہو گی اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ آنے والی کشمکش میں ان دھکوں سے محفوظ رہیں جو آپ کو پیچھے کی طرف دھکیل دینگے تو اس کیلئے آپ کو ابھی سے تیار رہنا اور جنگ کے بعد کی تعلیمی تعمیر کے متعلقہ مسائل پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔

ہمارے قومی یا اسلامی مسائل میں مشترکہ زبان کا سوال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ سے اگر اس ملک میں کسی زبان

کو مشترکہ زبان کا امتیازی درجہ حاصل ہو سکتا ہے تو وہ اردو ہے مسلمان اُستادوں
کا فرض ہے کہ وہ اردو کو فروغ دینے کے لئے اپنے شاگردوں سے بات چیت
کریں تو اردو میں۔ اردو ان کی قومی زبان ہونی چاہیئے۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ
روزمرہ کی گفتگو میں بلاضرورت انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس عادت
سے بچنا چاہیئے۔ قومی تعمیر میں زبان کا بہت بڑا دخل ہے۔ اگر آپ اردو کی ترقی
سے غافل رہیں گے تو آپ کو اپنی غفلت کا بہت بری طرح خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

حضرات! ہمارے تعلیمی نظام کا شیرازہ نہایت ابتر حالت میں ہے
ہمارے تمام مدرسے ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں ان میں کوئی رابطہ اور
اتحاد نہیں پایا جاتا اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ ان میں اشتراکِ عمل اور امدادِ باہمی
کی کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہونی
چاہئیں۔ ہمارے اتحاد کی زنجیر نہایت مضبوط ہونی چاہیئے۔ لیکن جب
کڑیاں ہی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہوں تو زنجیر کیسے بن سکتی ہے۔ تعلیمی
پہلو سے ہماری ناکامی کا یہ ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اگر آپ اشتراکِ عمل
اور امدادِ باہمی کے اصول کے قائل نہیں ہیں تو آپ کی کانفرنسوں اور سالانہ
جلسوں کو ایک نظر فریب نمائش سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔
آپ کے مرکزی نظام کی بنیاد نہایت مستحکم ہونی چاہیئے تاکہ اگر زنجیر کی کوئی
کڑی کمزور ہو جائے تو آپ اس کمزوری کا فوراً تدارک کر سکیں۔ ہیں اس مرکز

واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مجوزہ اتحاد سے میرا یہ ہرگز مقصود نہیں کہ تعلیمی اداروں کی آزادی کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جائے یا ان کے اندرونی نظام میں دخل دینے کے مواقع پیدا ہوں بلکہ اس کا یہ مقصد ہوگا کہ اگر کسی تعلیمی ادارے کو مدد یا مشورے کی ضرورت ہو تو وہ بلا تاخیر اسے مل سکے. گویا فیڈریشن کی بدولت نہ صرف مدرسے کی حالت درست ہو جائے گی بلکہ جو استاد اس مدرسہ میں کام کرتے ہیں ان کے حقوق اور مفاد بھی محفوظ ہو جائیں گے۔

ایک اور معاملہ بھی آپ کی توجہ کے قابل ہے، میری رائے میں پنجاب کے اسلامی مدارس کے لئے ایک خاص انسپکٹر مقرر ہونا چاہیئے، بنگال اور یوپی کی حکومتوں نے اپنے اسلامی مدارس کے لئے انسپکٹر مقرر کر رکھے ہیں. یہ تجربہ وہاں کامیاب ثابت ہوا ہے اور اگر پنجاب میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بجائے سرکاری انسپکٹر کے ہمارا انسپکٹر کسی اسلامی ادارے مثلاً پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مقرر کردہ ہو جو سال کے مقررہ ایام میں اسلامی مدارس کا معائنہ کرتا رہے مگر یہ معائنہ سرکاری انسپکٹر کے معائنے کی طرح نہ ہو کہ چند منٹ کے لئے مدرسے میں تشریف لائے سرسری نظر سے کام کا معائنہ کیا اور لاگ بک میں رائے لکھ کر روانہ ہو گئے۔ پھر رائے بھی ایسی جس سے زیادہ تر تصویر کا تاریک پہلو ہی نظر آئے۔ کانفرنس کے انسپکٹر صاحب سے یہ توقع رکھی جائے گی کہ وہ

ایک مخلص ہمدرد اور مشیر کی حیثیت سے معائنے کے فرائض انجام دے اور ضرورت پڑے تو جتنی دیر بلکہ جتنے دن چاہے قیام کرے تاکہ اس کی پیش کردہ تجاویز سے مدرسہ کی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے رفع ہونے کی صورت نکل آئے۔ اس کے علاوہ ایسے انسپکٹر کے تقرر سے اسلامی مدارس ایک دوسرے سے زیادہ مربوط اور وابستہ ہو جائیں گے میں نہ صرف اسلامی بلکہ تعلیمی نقطہ خیال سے بھی اس ارتباط اور وابستگی کو جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں آپ کے مدارس کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرات! میں خاتمہ پر پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری گزارشات کو توجہ سے سنا لیکن اس قدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ خطبہ صدارت کو توجہ سے سننے اور بہترین الفاظ میں قرارداد یں منظور کر دینے سے آپ کی مشکلات کے حل کا راز ایک سہ حرفی لفظ میں مضمر ہے اور یہ لفظ عمل ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ عمل کے لئے جسمانی مشین کے پرزے اس وقت تک حرکت میں نہیں آئیں گے جب تک کہ قوت ارادی سے کام نہیں لیا جائے گا۔ اس قوت کا ماخذ آپ کی شخصیت کا اخلاقی پہلو ہے۔ جس حد تک یہ پہلو مضبوط اور قوی ہوگا اسی حد تک آپ کو احساس ہوگا کہ شدید سے شدید مشکلات بھی

آپ کی پیش قدمی اور ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتیں مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ کانفرنس :-

نشستند و گفتند و برخاستند

کی تعریض سے محفوظ رہے گی۔ اگر آپ نے کام کا تہیہ کر لیا ہے تو خدا کی رحمت و نصرت ضرور آپ کے شاملِ حال رہے گی ۔

عَلّامہ اقبالؒ

انجمن کے جلسوں میں

واقفانِ حال جانتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی شاعری کا آفتاب انجمن حمایت اسلام لاہور کے افق سے طلوع ہوا تھا۔ علامہ مرحوم کی بیشتر معرکتہ الآرا نظمیں انجمن ہی کے پلیٹ فارم سے نشر ہوئیں اور پھر تو علامہ اقبال اور انجمن کے سالانہ جلسے لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے۔ رفتہ رفتہ علامہ مرحوم کو انجمن سے ایسا تعلقِ خاطر ہو گیا اور وہ انجمن کی سرگرمیوں سے اتنی دلچسپی لینے لگے کہ انہیں انجمن کا صدر بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب مرحوم نے کہ جو خود انجمن کے دیرینہ وابستگان میں سے تھے اور آخر میں اس کے صدر بھی ہو گئے تھے علامہ اقبالؒ اور انجمن کے تعلق پر ایک مقالہ انجمن کے سالانہ جلسے میں ارشاد فرمایا تھا جس میں پہلے انجمن کے پلیٹ فارم کی اہمیت اور پھر اس پلیٹ فارم پر علامہ اقبال کی تشریف آوری کی داستان بڑے دلچسپ رنگ میں بیان کی گئی ہے اور آخر میں انجمن کے نظم ونسق کے ساتھ ان کے تعلق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آئندہ صفحات میں یہ مقالہ درج کیا گیا ہے ؛

علّامہ اقبالؒ انجمن کے جلسوں میں

انجمن حمایت اسلام کے ساتھ اقبال کا تعلق محض حسنِ اتفاق یا حادثہ نہیں تھا۔ یہ ایک باشعور اور ذی حس فرد کا ایک فعّال قومی ادارے کے ساتھ ایسا تعلق تھا جسے ہم

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

کی عملی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ انجمن حمایت اسلام کے ساتھ اقبالؒ کی وابستگی ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم اور زریں باب ہے۔ اس لئے کہ انجمن حمایت اسلام ہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں عام ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ رہ کر قوم کی تعمیری سرگرمیاں نشوونما پا رہی تھیں۔ اس پلیٹ فارم پر سرسیدؒ، نواب وقار الملکؒ، شبلیؒ، حالیؒ، مولوی نذیر احمدؒ کے علاوہ سر فضل حسینؒ، سر محمد شفیع

سر ذوالفقار علی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لیے کوشاں تھے انہیں کوششوں کی برکت سے انجمن شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ اور جو لوگ ملت کے تعمیری مفاد سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اپنی سرگرمیوں کے لئے اس پلیٹ فارم کو ہی منتخب کرتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام شمالی ہندوستان میں وہی کام سرانجام دے رہی تھی جو سر سید نے تحریک علی گڑھ کے ذریعے انجام دیا تھا۔ البتہ یہ امتیاز ضرور تھا کہ انجمن متوسط طبقہ اور عوام سے زیادہ نزدیک تھی اور اس کی خدمات کا دائرہ زیادہ انہی طبقوں کو محیط کئے ہوئے تھا۔

جس وقت اقبال کے شعور نے آنکھ کھولی اور اس نے اپنے ماحول کا ایک سرسری سا جائزہ لیا تو اسے ہر طرف مایوسی ابے دلی اور شکست کے آثار دکھائی دیئے اور چونکہ وہ شاعر بھی تھا اور حکیم نکتہ داں بھی اس لئے اس نے جہاں ملت اسلامیہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے جھنجھوڑا۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ ایک لائحہ عمل بھی تجویز کر دیا۔ اس کی شخصیت جامع کمالات اور اس کا کلام اس کے دل و دماغ کی غیر معمولی اور لازوال قوتوں کا آئینہ دار تھا۔ اس لیے اس نے صرف ماضی کے ماتم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک روشن مستقبل کی نوید بھی دی۔

مجھے اقبال کے ساتھ تعلیمی اور سیاسی دونوں میدانوں میں کام کرنے کا

سعادت حاصل ہوئی۔ لیکن چونکہ اس تقریر کے موضوع سے ان امور کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے میں ان کا تذکرہ نہیں کروں گا اور اپنے بیان کو اقبالؔ کے انجمن کے ساتھ تعلقات تک ہی محدود رکھوں گا۔

یہ عزت اور سعادت انجمن حمایت اسلام کی قسمت میں لکھی تھی کہ وہ اس اقبالؔ کو دنیا سے روشناس کرائے جسے قدرت نے شاعرِ مشرق اور حکیم الامت بننے کے لئے نامزد کر رکھا تھا۔

انجمن حمایت اسلام نے ابھی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کی تھیں اور اس کا وہ مشن جسے چند مخلص بہی خواہانِ قوم نے محض اللہ کے بھروسے پر شروع کیا تھا عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگا تھا۔ اس وقت انجمن کے سالانہ جلسے شیرانوالہ اسکول کے اندرونی میدان میں منعقد ہوا کرتے تھے حکیم الامت علامہ اقبالؒ جو اس وقت محض شیخ محمد اقبالؔ تھے انجمن کے پلیٹ فارم پر پہلی مرتبہ ۱۸۹۹ء میں جلوہ افروز ہوئے اور "نالۂ یتیم" کے عنوان سے اپنی نظم پڑھی۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے جو میں نے والد بزرگوار مرحوم و مغفور سے سنا۔ ان دنوں ایک انگریزی لیکچر انجمن کے جلسوں کا مستقل فیچر ہوا کرتا تھا۔ "شیخ محمد اقبال ایم اے" کا نام پروگرام کمیٹی میں پیش ہوا۔ اور یہ طے پایا کہ ان کو نظم کے لئے وقت دیا جائے۔ مولوی علی محمد صاحب مرحوم

جو انجمن کے ایک نہایت مخلص کارکن تھے اور سالانہ اجلاس سے متعلق لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیا کرتے تھے جب کمیٹی کے فیصلوں کے مطابق پروگرام مرتب کرنے لگے تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ انگریزی خوان نوجوان انگریزی میں ہی کوئی نظم پڑھے گا۔ انہوں نے شیخ محمد اقبال صاحبؒ کے نام کے سامنے " انگلش پوئٹری " لکھ دیا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان دنوں کارپردازانِ انجمن میں سے بھی بعض اصحاب کو یہ گمان تک نہ تھا کہ جو شخص اپنی عمر میں پہلی مرتبہ انجمن کے اسٹیج کے ذریعہ پبلک کے سامنے آرہا ہے وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کرلے گا لیکن اسی اجلاس کی روئیداد سے پتہ چلتا ہے کہ " نالۂ یتیم " کے نفسِ مضمون اور شاعر کے دلکش لہجے نے وہ سماں باندھا کہ حاضرین جلسہ ہمہ تن گوش تھے اور ان کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ساری محفل پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ یہ نظم سراپا سوز و گداز اور مجسم درد و تاثیر ہونے کے باعث اس قدر مقبول ہوئی کہ حاضرین نے اکثر بند بار بار پڑھوائے جس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اشک افشانی کے ساتھ ساتھ زرافشانی بھی خوب کی۔ نظم کے دوران میں واہ واہ کے ڈونگروں کے ساتھ ہر طرف سے آہ آہ کی دردناک صدائیں بھی بلند ہوتی رہیں۔ نظم کے خاتمہ پر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے فرمایا :-

"میں نے ان کانوں سے انیس و دبیر کے مرثیے سنے مگر جس پایہ کی نظم آج سننے میں آئی اور جو اثر اس نے میرے دل پر کیا وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔"

نظم کے دو تین بند ملاحظہ فرمایئے:۔

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے
اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے
ظلِ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے
ہاں ڈبو دے لے محیطِ دیدۂ پُرنم مجھے
مضطرب اے دل نہ ہونا ذوقِ طفلی کے لئے
تو بنا ہے تلخیٔ اشکِ یتیمی کے لئے

اے گرفتارِ یتیمی اے اسیرِ قیدِ غم
تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیّدِ خیر الامم
ناامیدی نے کئے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم
چھیڑتا ہے دل کو تیرا نالۂ دردِ الم
تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے
شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

○

خون رلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مجھے
میری امت کیا شریکِ دردِ پیغمبرؐ نہیں
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشرؐ نہیں

○

غرضیکہ نظم کا ہر بند نالہ و فغاں کی تصویر ہے۔ اس نظم نے اقبالؒ کی شہرت کراچی سے رنگون اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلا دی۔ اقبالؒ پہلے ہی مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ اس جلسہ کے بعد انہوں نے اپنی قومی نظموں کے لئے انجمن کے پلیٹ فارم کو ہی منتخب فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبالؒ کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کا ایک خاص فیچر بن گئیں۔ چنانچہ آپ نے اپنی مشہور نظمیں فریادِ امت، تصویرِ درد، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر اور طلوعِ اسلام وغیرہ انجمن کے مختلف سالانہ جلسوں میں پڑھیں۔ اس طرح انجمن کے قومی پلیٹ فارم کی افادیت اور معنویت کو چار چاند لگا دیئے۔ اول الذکر اجلاس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اقبالؒ کے لئے انجمن سے وابستگی کا ایک اور موقع نکل آیا۔ شیخ عبدالقادر ان دنوں اخبار آبزرور کے ایڈیٹر اور اسلامیہ کالج میں ادبیات انگریزی کے پروفیسر تھے

انہیں چند روز کی رخصت لینی پڑی تو ان کی جگہ اقبالؒ مرحوم یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ مَیں ان دنوں ایف اے کا طالب علم تھا۔ نصاب میں "Seekers After God." یعنی "متلاشیانِ حق" کے نام سے ایک کتاب شامل تھی جس میں زمانہ قبل از مسیح کے تین حکماء کی سرگزشتیں درج تھیں۔ عیسائی مصنف نے ان "متلاشیانِ حق" کے بعض اقوال کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا۔ تھا۔ لیکن علامہ مرحوم نے کلام پاک کی آیات سے ان اقوال کی تشریح کی جو ان کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ موازنہ کے دوران میں آپ یہ بھی ثابت کرتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہر نوع اکمل ہیں۔ اسلامیہ کالج کی چند روزہ پروفیسری نے ہی آپ کے تبحر علمی کا سکہ بٹھا دیا۔

۱۹۰۳ء میں انجمن حمایت اسلام کا اٹھارہواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں میاں محمد شفیع۔ شیخ عبدالقادر اور میاں فضل حسین کے علاوہ علمائے دین میں سے حضرت قاری شاہ سلیمان پھلواری۔ مولانا محمد عبداللہ ٹونکی اور مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری نے بھی تقاریر فرمائیں۔ شعرائے کرام میں سے جناب چودھری خوشی محمد ناظر۔ شہزادہ ارشد گورگانی اور اقبال نے نظمیں پڑھیں۔ ارشد گورگانی نے جلسہ کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا:۔

کچھ اب کے سال تو جلوے نئے اس انجمن میں ہیں
وہ لوگ آئے ہیں جو استادِ کامل اپنے فن میں ہیں
ادیبانہ مضامین اس پہ معجز آفریں شوخی
کہیں ایسے مقرر دورۂ چرخِ کہن میں ہیں
کہیں مخزن کے ایڈیٹر کی دل خوش کن وہ رنگینی!
بھلا خوشبو کی لپٹیں ایسی کب مشکِ ختن میں ہیں
کہیں ناظر کی برجستہ متین وصاف وہ نظمیں
کہ گویا آپ رہ آئے کبھی باغِ عدن میں ہیں
کہیں اقبال کی اقبال مندی نظم سے ظاہر
کب ایسی شوکتیں موجود شاہانِ زمن میں ہیں

ان اشعار سے جہاں انجمن کے پلیٹ فارم کی اہمیت واضح ہوتی ہے وہاں اس دور کے جلسوں کا عام انداز بھی سامنے آجاتا ہے اور یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ متانت، وضع داری اور رکھ رکھاؤ ان جلسوں کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ اس جلسہ میں اقبال نے اپنی مشہور نظم "فریادِ ملت" پڑھی جس کے متعلق انجمن کے اس سالانہ جلسہ کی روئداد میں مرقوم ہے کہ :-

"اقبال صاحب کو جیسی خدا نے لیاقت عطا فرمائی دیا ہی قدرت نے ان کو گلا بھی عطا کیا ہے اور ایسی بلند اور

شیریں اور پر درد آواز کی نعمت مرحمت فرمائی ہے جو انہیں کا حصہ ہے۔ اس قدرتی عطیے کی امداد سے ان کے کلام کا جو فی ذاتہٖ نہایت عمدہ اور پر معنی ہوتا ہے۔ اثر دوبالا ہو جاتا ہے اس نظم پر بھی لوگوں نے چندہ دیا اور پانچ روپے فی کاپی تک خریدی چنانچہ اس قابلِ دید نظم کے بہت سے نسخے فروخت ہو گئے خواجہ عبدالصمد ککڑو نے شیخ محمد اقبالؒ صاحب کو اس نظم کے صلے میں ایک نقرئی تمغہ پہنایا"

اس نظم کے بارہ بند ہیں جن میں مسلمانوں کی مذہبی۔ سیاسی اور سماجی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور آخر میں شاعر بے قرار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم سے یوں خطاب کرتا ہے:۔

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کونسی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کونسی ہے
جس کی تاثیر سے ہو عزتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر وہ دعا کونسی ہے
جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری
ہاں بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کونسی ہے
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا

ناقہ وہ کیا ہے وہ آوازِ درا کونسی ہے

اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی

جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کونسی ہے

"فریادِ امت" میں قوم و ملت کی ترقی اور بہتری کی خواہش اور اس کی موجودہ حالت کا شدید احساس موجود ہے۔ اقبالؔ نے جب پہلی مرتبہ انجمن کے پلیٹ فارم سے آواز بلند کی تو وہ "نالۂ یتیم" کی شکل میں تھی۔ اب شاعر کے احساسات کا احاطہ وسیع ہوتا ہے تو "فریادِ امت" کی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر اس کے خیالات میں وسعت اور احساسات میں شدت برابر ترقی کر رہی ہے اور جب وہ انجمن کے انیسویں سالانہ جلسے میں آتا ہے تو "تصویرِ درد" کے عنوان سے یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے

چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

اس طویل نظم کے دس بند ہیں۔ جن میں شاعر نے ملک و ملت کے زخم ہائے پنہاں کو ہویدا کیا ہے اور لہو رو رو کے ساری محفل کو گلستاں کر کے چھوڑا ہے۔

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا
نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاک زنداں کی
کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا

انجمن حمایت اسلام کے چھبیسویں سالانہ جلسہ میں اقبال نے اپنی مشہور نظم شکوہ پڑھی۔ یہ اجلاس ۱۹۰۹ء میں ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا تھا ستائیسویں سالانہ جلسہ میں انہوں نے "خضرِ راہ" پڑھی۔ اس کے علاوہ "طلوعِ اسلام" اور "شمع و شاعر" بھی پہلی مرتبہ انجمن کے سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔ ایک مرتبہ انجمن کے منتظمین سے ناراض ہو گئے تو جلسہ میں آنے سے انکار کر دیا۔ لیکن چند مخلص دوستوں کے اصرار پر غلام قادر روہیلہ کے تاریخی واقعہ کو نظم کر دیا اور جلسہ میں شرکت کی ؎

روہیلہ کیا تھا ظالم تھا جفاجو تھا ستمگر تھا

اس مختصر سی تقریر میں ان مشہور و معروف نظموں کے اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس تقریر کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں جو حضرت اقبال نے انجمن کے سالانہ جلسہ میں ارشاد فرمائی، یہ تقریر انگریزی میں تھی اس کا موضوع یہ تھا

(Islam as a moral and political Ideal)

اس تقریر میں اقبال نے اسلام کے سیاسی اور اخلاقی نظام کی بالوضاحت تشریح کی ہے اور توحید و مساوات کو اسلامی آئین کی اساس قرار دیا ہے۔ ہمارے موجودہ حالات اس بات کے مقتضی ہیں کہ ہم اس تقریر کی روشنی میں اپنے سیاسی اور اخلاقی فکر کی تعمیر کریں۔ انجمن کے ایک اور جلسہ میں آپ نے "حیاتِ ملیہ" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی جس کا مطلع یہ تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

نواب سر ذوالفقار علی خاں نے انجمن کے بھرے جلسے میں اقبالؒ کو سعدی اور شیکسپیئر سے تشبیہہ دی اور کہا کہ اگر یہی اقبالؔ انگلستان میں ہوتا تو اس کی قدر و منزلت شیکسپیئر سے بھی بڑھ کر ہوتی۔ مگر افسوس کہ ہمارے اہلِ ملک اس کی قابلیت سے کم آشنا ہیں۔ اس کی دنیوی زندگی کے بعد معلوم ہو گا کہ اقبالؒ کیا تھا۔ شیخ عبدالقادر مرحوم نے اسی محفل میں کہا تھا۔

"ہم اپنے اساتذہ میں بڑے بڑے نام پاتے ہیں۔ انیسؔ

کی رزمیہ شاعری بے شک اس قابل ہے کہ یورپ کو اس سے روشناس کرایا جائے غالبؔ کے فلسفیانہ جذبات ہر طرح قابل عزت ہیں۔ مولانا حالیؔ نے سادہ طرز ادا میں زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ داغؔ کی خدمت بھی کم نہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کا فلسفیانہ رنگ بڑی عزت کے قابل ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر وہ کون ہے جس نے اس عروج رفعت پر جانے کا رخ کیا جو حقیقی شاعری کی منزلِ مقصود ہے؟ اور وہ کون ہے جس میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ صرف ایک ہی شخص ہے اور اس کا نام ڈاکٹر اقبالؒ ہے۔"

سن ۱۹۳۰ء میں انجمن کا چھیالیسواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت ہز ہائی نس نواب بہاولپور فرما رہے تھے۔ اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے یہ ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ علامہ اقبالؒ مرحوم نے اس تقریب پر ہز ہائی نس کی خدمت میں کلام پاک کا ایک نسخہ پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ وہ مبارک کتاب ہے جس سے عزیز تر متاع مسلمانانِ عالم کے پاس موجود نہیں۔ یہ پیش کش ایسی ہے جیسے کہ اپنے محبوب کے سامنے کوئی اپنا دل نکال کر رکھ دے اس تحفہ کو آپ کے لئے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کے جدِ امجد اس کتاب کے سب سے پہلے محقق تھے میری مراد حضرت ابن عباسؓ سے ہے، یہ کتاب جب

حضورؐ رسالت مآب پر نازل ہوئی تو آپ کے جدِّ امجد
نے سب سے پہلے اس کی تفسیر کی چنانچہ کتب صحیح میں مروی
ہے کہ ایک روز حضرت ابن عباسؓ مسجد نبویؐ میں قرآن پاک
کا درس دے رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ
وسلم تشریف لائے آپؐ نے دیکھا کہ ایک طرف ابن عباسؓ
درس دے رہے ہیں اور دوسری طرف چند صحابہؓ حضورؐ
کے انتظار میں حلقہ باندھے کھڑے ہیں۔ آنحضرت کچھ دیر
تک دونوں جماعتوں کے درمیان کھڑے رہے گویا یہ سوچ
رہے ہیں کہ پہلے کس طرف جائیں۔ آخر آپ یہ کہہ کر ابن عباسؓ
کے گروہ کی طرف چل دیئے کہ "میں معلّم مبعوث ہوا ہوں مجھے
رہنما کی طرف جانا چاہیئے۔"

پھر ہز ہائی نس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس نسبت سے آپ اس بات کا اندازہ کر سکیں گے کہ
مسلمانانِ پنجاب اگر آپ سے محبت رکھتے ہیں تو اس کی وجہ
صرف یہی نہیں کہ آپ ایک بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا
ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ دینی اعتبار سے ہمارے
بزرگ اور مخدوم ہیں۔"

اعلیحضرت نے یہ تحفہ بڑی عقیدت کے ساتھ قبول کیا۔ کلام پاک کو بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔ غالباً ۱۹۲۹ء کے اواخر یا ۱۹۲۹ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ علامہ مرحوم نے "اسلامی الہیات کی جدید تشکیل" کے سلسلہ کا ساتواں اور آخری لکچر اسلامیہ کالج حبیبیہ ہال میں دیا تھا۔ اس کے بعد انجمن کے پلیٹ فارم پر آپ کی آخری نظم وہ تھی جس میں یہ بتایا تھا کہ اثباتِ توحید کے بغیر حیات انسانی اپنے مرکزی نقطہ سے محروم رہتی ہے۔ یہ نظم آپ خود پڑھنا چاہتے تھے لیکن گلے نے ساتھ نہ دیا۔ دو شعر بھی بمشکل پڑھ سکے تھے کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئے اور ملک محمد صدیق نے یہ نظم پڑھ کر سنائی:۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ

خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

انجمن حمایت اسلام کے ساتھ اقبال کی وابستگی کا مختصر سا حال میں نے بیان کر دیا ہے۔ اس کی شاعری اور پیغام میری تقریر کا موضوع نہیں اور نہ ہی یہ مختصر صحبت ان تفصیلات کی متحمل ہو سکتی ہے۔ البتہ ختم کرنے سے پہلے چند

الفاظ میں انجمن کے نظم و نسق کے ساتھ اقبالؒ کا تعلق بیان کروں گا ۔

۱۹۰۳ء میں شیخ محمد اقبال انجمن حمایت اسلام کی مجلس منتظمہ کے رکن منتخب ہوئے اور اس حیثیت میں انجمن کی سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ رہے تا آنکہ ۱۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو آپ آنریری جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے جب استعفیٰ دیا تو وہ محض اس خیال سے منظور کر لیا گیا کہ آپ کی خدمت میں صدارت کی پیش کش کی جائے اور فی الواقعہ آپ کو صدر منتخب بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر آپ نے صدارت قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس عرصہ میں احباب کی طرف سے برابر اصرار ہوتا رہا۔ لیکن ان کا انکار اس قدر قوی تھا کہ ۱۹۳۴ء تک مغلوب نہ ہو سکا۔ بالآخر ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو آپ نے انجمن کی صدارت قبول فرمائی۔ لیکن علالت نے اس قدر شدید شکل اختیار کر لی تھی کہ آپ صدارت کے دفتری فرائض انجام دینے کے ناقابل ہو گئے اور اسی بنا پر استعفیٰ پیش کر دیا۔ یہ مرض آخر کار مرض الموت ثابت ہوا اور چند ماہ بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ملت اسلامیہ کے اس جلیل القدر فرزند نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اس بر کالج کا وہ میدان جو کبھی اس کے دل سوز نغموں سے گونجا کرتا تھا ماتم کدہ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی جو قلب کو

گرماتی اور روح کو تڑپایا کرتی تھی۔ اس ساز کے تار ٹوٹ گئے جس نے دنیا کو مسحور کر رکھا تھا۔

لوگ اپنے قائد اور مفکر کا آخری دیدار کرنے کے لئے جمع تھے۔ وہ خود نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ابدی نیند سو رہا تھا اور مشتاقوں کا ماتم و شیون اور آہ و بکا اس کی نیند میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا تھا۔ یہ وہی اقبال تھا جس نے پہلی مرتبہ انجمن کے پندرھویں سالانہ جلسے میں "نالۂ یتیم" کے عنوان سے نظم سنا کر لوگوں کو اشک بار کیا تھا اور خود چالیس برس کی مختصر مدت کے بعد ساری قوم کو یتیم کر کے جنت کو سدھار چکا تھا جو اس کے فراق میں غم و الم کی گہرائیوں کے باعث اشک بار تھی۔ یہ وہی اقبال تھا جس نے کبھی "بانگِ درا" کے نغموں سے قوم کی نازک ترین حسیات کو مرتعش کیا تھا۔

کبھی "بالِ جبریل" سے رفعتوں اور بلندیوں تک لے اڑنے کا تہیہ کیا تھا اور کبھی "ضربِ کلیم" کی معجزانہ ضرب سے قلوب میں بیداری پیدا کرنی چاہی تھی۔ آخر کار وہ صورِ اسرافیل کے ذریعے ملت کے تنِ مردہ میں روحِ حیات پھونکنا چاہتا ہی تھا کہ خود زندگی کے عارضی بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تعلیم اور مُعلّم

۱۲ ر مئی ۱۹۵۱ء کو سابق پنجاب کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کی ایک کانفرنس ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب مرحوم کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں خلیفہ مرحوم نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ اس فاضلانہ اور فکر انگیز خطبے میں خلیفہ صاحب مرحوم نے بتایا ہے کہ تعلیم کا حقیقی نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔ ہمیں کس نظام تعلیم کی ضرورت ہے اس سلسلے میں حکومت کے علاوہ خود ہم پر کیا ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور یہ کہ معاشرے میں معلم کو اس کا صحیح مقام کس طرح مل سکتا ہے؟

تعلیم اور معلّم

حضرات! میں بہت خوش ہوں کہ ہمارے صوبے کے صدر مدرسین نے وقت کی آواز پر اس بیدار مغزی سے کان دھرا ہے جس کا اظہار آج شام کی کانفرنس کرتی ہے۔ یہ ایک بہت مبارک فال ہے کہ آپ سب صاحبوں نے قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو اس طریقے پر محسوس کیا ہے کہ جمع ہو کر مشاورت کے ذریعے سے قومی زندگی کے اس بنیادی نصب العین کے حصول کے لئے عملی اقدام کر رہے ہیں۔ میں اس کانفرنس کے مہتممین کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے ضرورتِ وقت کو سمجھا اور سمجھ کر مناسب عمل کیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کانفرنس محض "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق ثابت

نہیں ہو گی بلکہ " برخاستنند " کی منزل تک پہنچتے پہنچتے مفید اور دوررس نتائج وعزائم مرتب کرے گی۔

اس کانفرنس کے مقاصد جو آپ کے سیکرٹری صاحب نے اپنی گشتی چٹھی میں تحریر فرمائے ہیں اپنی ہمہ گیری اور ہمہ بینی کے لحاظ سے منتم بالشان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان پر اپنی انتہائی توجہ اور غور و خوض مبذول فرمائیں گے۔ مجھے ذاتی طور پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام بلند مقاصد میں سے نمبر ۲ خصوصیت سے اہم اور قابل توجہ ہے۔ میں نے یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ میرے نزدیک آپ کی فہرستِ مقاصد کی اس دفعہ میں ہمارے تعلیمی مسئلے کا حل پوشیدہ ہے۔ اس دفعہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو کا تعلق ان ذرائع و وسائل سے ہے جو ہمیں اس وقت میسّر ہیں۔ دوسرے پہلو کو حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر سے تعلق ہے۔ آپ کی فہرستِ مقاصد کی اس دفعہ کی اہمیت پر یوں زور دینے سے میری مراد باقی دفعات کی اہمیت سے انکار کرنا نہیں ہے لیکن یہ حقیقت بہرحال مسلم ہے کہ جب تک آپ ملک کے تعلیمی نصب العین کا ایک واضح تصوّر قائم نہیں کر لیں گے، آپ کے لئے اس تصور کی عملی تشکیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جمہوری ممالک کے جمہوری ادارے عام تعلیم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔ اس مسلمہ حقیقت کو میں عام طور پر یوں بیان کیا کرتا ہوں کہ علم اصل اسلام ہے

اور جہالت کے راستے شرک اور بدعت اور بد اخلاقی کی طرف لے جاتے ہیں، پاکستان میں تعلیم کا عام نہ ہونا قیامِ پاکستان کے بنیادی مقاصد کی نقیض ہے۔ ہر وہ کوشش جو تعلیم کو صالح اور سہل الحصول بناتی ہے وہ ہماری قومی زندگی کی بنیادوں کو بھی مستحکم کرتی ہے۔ یوں دیکھئے تو تعلیم کا مسئلہ اس وقت ہماری حیاتِ اجتماعی کے مرکزی مسائل میں سے ہے اور اسے ہماری تعمیری کوششوں میں وہی مقام ملنا چاہیئے جو اس کی شان کے شایاں ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کی اٹھان کچھ اس طریقے پر ہوئی ہے کہ یہ قدم قدم پر ہماری موجودہ ضروریات کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ دراصل یہ نظامِ تعلیم ترکہ ہے ہمارے ایامِ غلامی کا۔ یہ جن مقاصد کے تحت تیار ہوا تھا ان میں اور ہمارے موجودہ مقاصد میں بعد المشرقین ہے۔ ان حالات میں تعلیمی مقاصد کی تشکیلِ جدید ناگزیر ہے۔ ہمیں اب ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے مدرسوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو سچا مسلمان بنائے اور اس طرح انہیں پاکستان کے وفادار اور ایثار پیشہ شہری بننے کی صلاحیت عطا کرے۔

حضرات! آپ کے سامنے اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ اسلام محض مذہبی اعتقادات و مسائل کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ہماری دنیوی اور اخروی دونوں قسم کی فلاح کا ضامن ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے

ہیں اسلام کی ایک وجہ امتیاز یہ ہے کہ اصولی طور پر یہ ایک فلسفۂ عمل ہے ہمیں موجودہ حالات میں ایک ایسے طریقِ تعلیم کی ضرورت ہے جو اسلامی فلسفہ عمل کے لئے ساز گار ہو۔ اس کانفرنس نے ہماری اسلامی اور تعلیمی مقاصد کی وحدت کو اگر اس طرح مشخص کر لیا تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اسلام اور پاکستان دونوں ہم سے یہی توقع رکھتے ہیں۔

حضرات! ہمیں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی قلمرو کے شہری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس قلمرو کے قیام کا تصور علامہ اقبال نے قائم کیا اور اس تصور کو عملی صورت حضرت قائدِ اعظمؒ کی مساعی جمیلہ سے ملی۔ یہ دونوں بزرگ اپنا اپنا فرض ادا کر کے معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔۔ جس منزل کی طرف ان بزرگوں نے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ ادھر آگے بڑھنا اب ہمارا کام ہے۔ میری مراد اس نصب العین کی تشکیل سے ہے جو علامہ اقبال کے نظامِ افکار میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی ایک ایسی سوسائٹی کی تخلیق جس میں فرد اور جماعت دونوں کی زندگی کی بنیاد اصولِ اسلام پر ہو۔

حضرات! آپ سب اپنی ذاتی حیثیت میں اور اس کانفرنس کے ذریعے سے اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی اس ذمہ داری سے بخوبی آگاہ ہیں اور قومی خدمت کے اس شعبے میں آپ کی سرگرمیاں ضرور مفید نتائج پیدا کریں گی۔

شاید بے محل نہ ہو اگر اس موقع پر میں اس غلط فہمی کی طرف اشارہ کروں
جو ہمارے ملک کے بعض تعلیمی حلقوں میں کچھ عرصے سے پیدا ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی
یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے تمام انفرادی اور اجتماعی
کاروبار کا انصرام خود حکومت کا فرض ہو گیا ہے۔ سیاست، تجارت، تعلیم،
غرض ہر شعبۂ حیات کی تنظیم، پرائیویٹ اداروں کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے
ہاتھ میں چلی جانی چاہیئے۔ اس اندازِ خیال میں کبھی بہت زیادہ مبالغہ کیا جاتا ہے
اور لوگ یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے کہ موجودہ اسلامی تعلیم گاہوں کا آزادانہ وجود
ختم کر کے انہیں حکومت کے محکمہ تعلیم کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اس طریق عمل کی
تائید میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہمارا ملک چونکہ خود ایک اسلامی ملک ہے
اس لئے یہاں اسلامی اداروں کے علیحدہ وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری
رائے میں یہ عجیب و غریب مغالطہ ایک قسم کی خود فریبی پر مبنی ہے۔ یہ دلیل ان
لوگوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے جو یا تو خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا چاہتے
ہیں اور یا حکومتِ وقت کو زمین و آسمان کی جماعتوں کا طبیب سمجھتے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا مسئلہ اپنی اصل کے لحاظ سے ایک قومی مسئلہ ہے اور
کوئی حکومت (خواہ وہ کتنی ہی منتظم اور با تدبیر اور کارداں ہو) اس سے
کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ یہ حقیقت دنیا کے تمام مہذب ممالک میں اس
قطعیت کے ساتھ تسلیم ہو چکی ہے کہ بیشتر درسگاہوں کے بانی اور منتظم

غیر سرکاری افراد اور ادارے ہیں اور ان درس گاہوں کی مالیات کا نظم و نسق بھی غیر سرکاری ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ اس تعلیمی انتظام کے نتائج خاطر خواہ ثابت ہوئے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی درس گاہیں جن منتظمین کی تحویل میں ہیں ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان درسگاہوں کو قومی ضروریات کے مطابق چلائیں اور اپنے ہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو اس قابل کر دیں کہ وہ زندگی میں داخل ہو کر اپنا کام خوش اسلوبی اور کامیابی سے سرانجام دے سکیں۔

خاتمۂ کلام سے پہلے میں آپ کی فہرستِ مقاصد کے اس حصے سے ذاتی طور پر اپنی ہمدردی ظاہر کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ نے سروس رولز کو بہتر بنانے اور معلمی کے پیشے کو باوقار سطح پر لانے کے سلسلے میں اپنے عزم کا اظہار کیا ہے۔ میرا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ معلمی کا شمار ان چند پیشوں میں ہے۔ جو نہایت قابل احترام ہیں۔ میرے نزدیک حکومت اور عوام الناس دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ معلمین کے مرتبے اور وقار کو برقرار رکھنے میں مناسب سعی کریں۔ بدقسمتی سے اب تک اس فرض کو ادا کرنے میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے اور اس کوتاہی کی علت بھی وہی ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں یعنی ایک غیر ملکی، غیر قومی نظامِ تعلیم کے چھوڑے ہوئے مضر اثرات۔ اب ملک و قوم کی آزادی کے ساتھ اس مسئلے پر از سر نو توجہ دینے کی

ضرورت ہے۔ ہمارے اساتذہ ہماری قومی زندگی کے معمار ہیں۔ قومی زندگی کی تعمیرِ نو اسی صورت میں ممکن ہے جب اس زندگی کے معماروں کی خوش حالی کی صحیح ضمانت دی جائے اور ان کا معیارِ زیست کم از کم ایک خاص سطح سے نیچے نہ گرنے دیا جائے۔ آزاد ممالک میں تعلیم کے لئے رقومِ خطیر وقف کی جاتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان باقی مہذب دنیا کے طریق عمل پر کاربند نہ ہو۔

حضرات! اس سلسلے میں خود آپ پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ کہنے کی جسارت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ معلمی کے معاشرتی مقام کو بلند کرنا ایک حد تک خود آپ کے ہاتھ میں بھی ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں بڑے ادب کے ساتھ یہ کہوں گا کہ آپ کو اس احساسِ کمتری سے نجات حاصل کرنی چاہیئے جو آپ کی جماعت کے کم از کم ایک حصے پر غالب آچکا ہے۔ احساسِ کمتری کو دل میں جگہ دینا مسلمان کا کام نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہ فرمودۂ ربانی موجود ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

سچے مسلمان کا مقام ہمیشہ بلند ہے اور مسلمان قوم کے اُستاد کو تو روحانی طمانیت سے وہ بلند رتبہ عطا ہوا ہے کہ اگر دنیا اس کا مرتبہ پہچاننے میں کوتاہی بھی کرے تو وہ خود اپنی عزت کرتا ہے اور اپنی عزت اس طرح پر کرتا ہے کہ بالآخر دنیا اس کا صحیح مرتبہ پہچاننے پر مجبور ہو جاتی ہے مجھے امید ہے کہ آپ اپنے

قول و فعل سے اپنے تلامذہ کے قلب و دماغ کو خودی کے اس تصور تک پہنچا ئیں گے جس کی اشاعت کے لئے علامہ اقبال کی تمام زندگی وقف رہی۔

حضرات! اس اعزاز کے لئے جو آپ نے آج شام مجھے بخشا، میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کے باہمی مشوروں کی ہر منزل میں میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں، اور ان مقاصد کی تمام تفصیلات میں کامیاب و بامراد کرے۔

آمین

عمر فاروق رض

الحاج ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب مرحوم کا یہ وہ خطبۂ صدارت ہے جو آپ نے ۴ اگست ۱۹۵۱ء کو جلسہ "یومِ عمرؓ" میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہ جلسہ جمعیت العلمائے پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ خلیفہ صاحب مرحوم کے اس خطبۂ صدارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخ اور قانونِ اسلامی دونوں کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اس خطبے میں انہوں نے حیاتِ عمرؓ کی بکھری ہوئی کڑیوں کو بڑے سلیقے سے مربوط کیا ہے اور پھر حضرت عمرؓ کی زندگی کا تجزیہ کر کے ہمیں بتایا ہے کہ موجودہ زمانے کی زرعی، اقتصادی اور سیاسی افراتفری میں اگر ہمیں کہیں سے رہنمائی مل سکتی ہے تو وہ حضرت عمرؓ کا روشن مینارۂ حیات ہے۔

عمر فاروق رضؓ

حضرات! یہ موقع نہیں ہے کہ میں فاروقِ اعظم رضؓ کے سوانح حیات کا کوئی جامع مرقع آپ کے سامنے پیش کروں۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے، میرے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ یہاں آپؓ کے ان کمالات کی طرف اشارہ کروں جو بطورِ خاص ہمارے موجودہ مسائل حیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور ہمارے حل طلب مسائل بھی اسی لحاظ سے عظیم الشان ہیں۔ اسلام ان مسائل کے حل کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے، اس کے لئے ہمیں لامحالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے جسے مسلم اور غیر مسلم

مورخین بلا استثنا خراج تحسین ادا کرتے چلے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے برعظیم پاکستان و ہند کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ یاد آتا ہے جس کا حوالہ دیئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ دس گیارہ برس پہلے برطانوی ہندوستان کے متعدد صوبوں میں کانگرسی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اس وقت ان حکومتوں کو ہندو قوم کے سب سے بڑے رہنما مسٹر گاندھی نے عجیب و غریب مشورہ دیا۔ مسٹر گاندھی کا مشورہ یہ تھا کہ کانگرسی حکومتیں صوبوں کے سیاسی انتظام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قائم کئے ہوئے بلند نمونے کی تقلید کریں۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ کانگرسی حکومتوں نے مسٹر گاندھی کے اس مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی یا نہ کی۔ لیکن یہ مشورہ ہمارے لئے مقامِ عبرت ضرور ہے۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

جب غیروں کو ہمارے گھر کی شمعوں کی روشنی یوں نظر آتی ہے اور وہ اس سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہم اپنے اس تاریخی حق سے فائدہ اٹھانے کے لئے کیوں مضطرب نہ ہوں؟ میں آج اسوۂ فاروقی رضی اللہ عنہ کے اسی پہلو پر آپ کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

حضرت عمرؓ قریش کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ

نجیب الطرفین تھے۔ آپ کے والد خطاب بن نفیل اپنے آباؤ اجداد کی طرح قریش میں خاص احترام سے دیکھے جاتے تھے چنانچہ ذمہ داری اور عزت کے متعدد مناصب انہیں تفویض تھے۔ ان ذمہ داریوں میں خانہ کعبہ کی نگرانی، حجاج کی خبرگیری، سفارت اور فصل مقدمات جیسے اہم فرائض کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی والدہ عنتمہ، ہشام بن مغیرہ کی صاحبزادی تھیں۔ قبیلہ قریش کو جب کبھی کسی دوسرے قبیلے سے جنگ درپیش ہوتی تو تمام ضروری انتظامات مغیرہ ہی کے سپرد کئے جاتے تھے۔ گویا حضرت عمرؓ کو اپنے ایک جد کی طرف سے اعلیٰ انتظامی قابلیت اور دوسرے جد کی طرف سے اسی درجے کی اعلےٰ حربی قابلیت ورثے میں ملی تھی۔ آپ کی ایک اور نسبی حیثیت بھی آپ کے لئے موجب فخر و مباہات تھی یعنی آپ کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا ملتا تھا۔

حضرت عمرؓ ہجرت نبویؐ سے چالیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ ان کے ایام طفولیت و شباب کے متعلق ہماری معلومات کا سرمایہ قدرتاً محدود ہے۔ روایت یہ ہے ان ایام میں آپ کے وقت کا خاصا حصہ اونٹ چرانے میں گذرتا تھا اور آپ کے والد جو بہت سخت گیر بیان کئے جاتے ہیں ذرا سی غفلت پر بھی آپ کو سخت سزا دینے سے نہیں چوکتے تھے۔

شاید یہی ابتدائی تجربات تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ کو انتظامی اور تادیبی معاملات میں عمر بھر کے لیے کڑے اصولوں کی پابندی سکھادی تھی۔

جب آپ سنِ بلوغ کو پہنچے تو ان تمام اوصاف سے متصف تھے جن سے اس زمانے میں کسی اونچے گھرانے کے چشم و چراغ کو بہرہ ور ہونا چاہیے تھا یعنی پہلوانی کی مہارت، عسکری تربیت، نسب دانی اور خطیبانہ قدرت ان سے قطع نظر آپ کو ایک اور ایسی استعداد میسر تھی جو اس زمانے میں تقریباً ناپید تھی اور وہ یہ کہ آپ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ اس وقت قریش کے پورے قبیلے میں صرف سولہ یا سترہ پڑھے لکھے آدمی تھے حضرت عمرؓ انہیں سولہ یا سترہ آدمیوں میں سے ایک تھے۔

حضرت عمرؓ بعثت رسولِ پاک صلعم کے وقت عمر کے ستائیسویں سال میں تھے۔ ان کے دل میں بھی اپنے عام ہم چشموں کی طرح اسلام کے خلاف انتہائی عداوت کا جذبہ موجزن تھا اور مسلمانوں کو طرح طرح کی ایذائیں دینے بلکہ زدو کوب کرنے میں بھی ان کو دریغ نہ تھا۔ اس وجہ سے مسلمان اپنے اسلام کا اظہار کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ حضرت زیدؓ جو حضرت عمرؓ کے عم زاد بھائی تھے بُت پرستی سے منہ موڑ کر ظہورِ اسلام سے پہلے ہی عقیدۂ توحید اختیار کر چکے تھے۔ حضرت زیدؓ کا توحید باری تعالیٰ کی دعوت دینا گویا تمام قریش کی دشمنی مول لینا تھا ان پر تشدد کرنے والوں میں

حضرت عمرؓ پیش پیش تھے لیکن زیدؓ اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کی دعوت ان کے اپنے کنبے اور حضرت عمرؓ کے کنبے کے کانوں تک پہنچ چکی تھی ان کے بیٹے سعیدؓ اور سعیدؓ کے ساتھ ان کی بیوی فاطمہؓ جو حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ تھیں دونوں دینِ برحق کو قبول کر چکے تھے اور اس خاندان کے ایک رکن نعیمؓ بن عبداللہؓ بھی اسی طرح مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس حضرت عمرؓ نہ صرف خود اسلام سے انکار کرتے تھے بلکہ ہر اس شخص کے دشمن تھے جو اسلام قبول کر چکا تھا۔

اندریں حالات یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اہلِ ایمان کی چھوٹی سی جماعت قریش کے تشدد سے بالعموم اور حضرت عمرؓ کے جبروت سے بالخصوص خائف رہتی تھی۔ اس وقت تک چالیس پچاس افراد جن میں حضرت امیر حمزہؓ بھی شامل تھے دینِ برحق پر ایمان لا چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت کا فریضہ علی الاعلان ادا نہیں کر سکتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ حضرت عمرؓ خود رسولِ مقبولؐ کی جان لینے کی فکر میں پھرتے تھے مگر اس سرچشمۂ رحمتؐ کے لبوں پر یہ دعا تھی کہ الٰہی عمر کو مشرف بہ اسلام کر۔ یہ دعا بالآخر قبول ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا قصہ اگرچہ معروفِ عام ہے مگر اس قصے کی تکرار میں بھی ایک نئی لذت ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ تلوار باندھے ہوئے بزعم خود رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو ختم کرنے

کے لیے چلے جاتے تھے کہ نعیمؓ بن عبداللہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ نعیم بن عبداللہ کو جب حضرت عمرؓ کی نیت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے فوراً کہا۔" پھر سب سے پہلے اپنے اہل خاندان کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی بھی تو مسلمان ہو چکے ہیں!" اب حضرت عمرؓ کے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے خانۂ رسولؐ سے رخ پھیر کر اپنی بہن کے گھر کا رستہ لیا۔ وہ نیک خاتون اس وقت تلاوت کلام پاک میں مصروف تھیں ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کی آمد پر انہوں نے تلاوت بند کر دی اور جو اجزائے قرآن ان کے ہاتھ میں تھے انہیں فوراً کہیں چھپا دیا لیکن حضرت عمرؓ کے کان میں بہن کی قرآن خوانی کی آواز پڑ چکی تھی کڑک کر بولے۔" تم لوگ اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہو!" اور یہ کہتے ہی اپنے بہنوئی پر پل پڑے۔ فاطمہ بیچ بچاؤ کے لیے اٹھیں تو انہیں بھی چوٹیں آئیں یہاں تک کہ خون بہنے لگا۔ اب ان کی زبان سے بے اختیار نکلا:

"عمرؓ! جو جی میں آتی ہے کر گزرو۔ ہم دونوں مسلمان ہیں اور اس سچے دین کو کبھی نہ چھوڑیں گے!" حضرت عمرؓ کی شریفانہ فطرت بہن اور بہنوئی پر اپنے تشدد سے پہلے ہی متاسف ہو رہی تھی۔ اب بہن کے ان پرخلوص الفاظ نے انہیں اور بھی متاثر کیا اور بولے:" تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ۔" اس پر اُن کی

بہن فاطمہؓ نے سورۃ الحدید کی تلاوت شروع کی

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ

اور جب ان کی پر اثر آواز اس آیت تک پہنچی : اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
تو حضرت عمرؓ بے اختیار ہو کر پکار اٹھے :

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اس غیر متوقع صورت حال کو دیکھ کر سعیدؓ اور فاطمہؓ کی جو کیفیت ہوئی وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اسی حالت میں حضرت عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں رسولِ پاکؐ کفار کے جبر و تشدد کے ہاتھوں مجبور ہو کر حضرت ارقمؓ کے مکان میں پناہ گزین تھے۔ حضرت عمرؓ نہیں پہنچے تلوار اب بھی ہاتھ میں تھی لیکن اب ان کے پہلے ارادے اور دل کی موجودہ کیفیت میں گویا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ صحابہؓ کو ان کے یوں آنے پر کچھ تشویش ہوئی، لیکن آنحضرتؐ نے ان کو تسلی دی کہ عمرؓ کو داخل ہونے سے نہ روکیں جب وہ اندر آئے تو آنحضرتؐ خود آگے بڑھ کر ان سے ملے اور کہنے لگے۔ "کہو کس نیت سے آئے ہو؟" حضرت عمرؓ اب خود جذبہ رسالت سے متاثر تھے، انہوں نے سیدھا جواب دیا۔——
"ایمان لانے کیلئے حاضر ہوا ہوں" اس ایک قبول اسلام کی

شان ملاحظہ ہو کہ خود جناب رسالتمآب کی زبان مبارک سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی صحابہ کے منہ سے بھی تکبیر کی صدا اس جوش و خروش سے نکلی کہ مکہ معظمہ کے اطراف کی پہاڑیاں گونج اٹھیں

حضرت عمرؓ کا ایمان لانا یوں تھا جیسے تاریخ اسلام کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انہوں نے دوسرے صحابہؓ کی طرح اپنے اسلام کا اخفا نہیں کیا بلکہ پورے زور سے اعلان کیا اور کفار کی ہر ترہیب و تعذیب کا اس طرح استقلال سے مقابلہ کیا کہ بالآخر خانہ کعبہ میں کھلے بندوں نماز ادا کی۔ ابن ہشام نے یہ پورا واقعہ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے نقل کیا ہے اور عبداللہ بن مسعودؓ کے ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ:-

"فَلَمَّا اَسْلَمَ عُمَرُ قَاتَلَ قُرَيْشًا حَتّٰى صَلّٰى عِنْدَ الْكَعْبَةِ وَصَلَّيْنَا مَعَهٗ"

یہ واقعہ بعثت کے چھٹے سال پیش آیا۔

حضرات، اس قلیل مہلت میں میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تمام مہمات امور کا تذکرہ کروں جو استحکام ملت کی راہ میں حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ان کے قبول اسلام کے دن سے لے کر تا دمِ آخر سرانجام پائیں۔ میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ جہاں تک رسول اللہ کی حیات طیبہ کے دوران میں پیش آمدہ واقعات کا تعلق ہے آپؐ کو ہر

معاملے میں نہایت اہم دخل رہا، خواہ اس معاملے کا تعلق غزواتِ نبوی سے ہوتا یا ان معاہدات سے جو حضور صلعم نے بیرونی طاقتوں سے طے فرمائے یا تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے بنیادی فریضے سے، یا پھر ان انتظامی تدابیر سے جو ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے وقتاً فوقتاً عمل میں آتی رہیں۔ بالآخر، کیا عرب اور کیا عجم، ہر کسی نے دیکھ لیا کہ حضرت عمرؓ اسی دینِ قیم کی پشت پناہ بن گئے جسے عرب کی سرزمین سے مٹانے کے لئے وہ اوّل اوّل اٹھے تھے۔

با ایں ہمہ فاروق اعظمؓ کی سیرت کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ اسلام سے ان کی شیفتگی اس بلندی پر پہنچ گئی تھی کہ ان کے لئے ایمان کے مقابلے میں ذاتی اغراض یا قرابت داری کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ غزوہ بدر میں ان کا سامنا ہشام بن مغیرہ کے بیٹے عاص سے ہوا۔ عاص بن ہشام حضرت عمرؓ کے حقیقی ماموں تھے لیکن اس پر بھی مقابلہ جب کفر و اسلام میں ٹھہرا تو حضرت عمرؓ نے انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ پھر حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ آیا۔ اب بھی فدویتِ حق کا یہی جذبہ اسی بے باکی سے قائم رہا۔ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دونوں فرزند بصرے گئے۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے جو حاکمِ بصرہ تھے ان کی مہمان داری کی اور جب وہ رخصت ہونے تو

بیت المال سے ایک رقم نکال کر انہیں اس غرض سے دی کہ بصرے سے مال تجارت خریدنے میں صرف کریں۔ پھر یہ مال مدینے میں فروخت کریں۔ نفع خود رکھیں اور اصل رقم بیت المال کو واپس کر دیں۔ حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع پہنچی تو انہوں نے پوچھا۔ "کیا ابوموسیٰ کا یہ سلوک سب مسلمانوں کے لئے عام ہے یا صرف تم سے یہ خصوصیت روا رکھی گئی ہے؟" جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ رعایت تمام مسلمانوں کو بالعموم میسر نہیں ہے تو انہوں نے حکم دیا کہ نہ صرف اصل رقم بلکہ وہ منافع بھی جو اس رقم سے خریدے ہوئے مال تجارت پر حاصل ہوا بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔ فاروق اعظمؓ کے لئے اسلامی احساس و کردار کا یہ بلند نصب العین اس لئے قابل عمل تھا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا دنیا کے ہر تعلق اور ہر قرابت سے زیادہ عزیز تھی۔

فاروق اعظمؓ کی خلافت کی کل مدت دس سال چھ مہینے اور چار دن ہوئی۔ ہمیں یہ مدت قدرتاً مختصر سی معلوم ہوتی ہے لیکن بایں ہمہ حسن انتظام حسن اخلاق، تدبر اور اعلیٰ درجے کی مجاہدانہ صلاحیتوں کی کتنی مثالیں ہیں جو اس دہ سالہ عہد خلافت کو تاریخ کے طالب علم کے لئے منور کر رہی ہیں! اس عہد میں عساکر اسلام کو جو حیرت انگیز فتوحات حاصل ہوئیں ان کی کیفیت کسے معلوم نہیں! ان فتوحات کے متعلق ایک دلپذیر نکتہ ایسا ہے جو خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے تمام محاربات

غزوات نبویؐ کی طرح مدافعانہ تھے۔ ان اسلامی محاربات کے پس منظر پر ایک نظر ڈالئے تو یہ نکتہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

ہجرت نبوی کے پہلے سال میں رسول اللہؐ نے مختلف بادشاہوں کو مکاتیب بھیج کر دعوت اسلام دی۔ ایک مکتوب خسرو پرویز شاہ ایران کے نام بھی گیا۔ یہ مکتوب دائمی امن و سلام کا پیغام لے کر گیا تھا۔ اس میں کسی مقابلے یا محاربے کا ذکر نہ تھا۔ پھر بھی پرویز غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا کہ کیوں اس کی "اپنی رعایا میں سے ایک شخص" نے اس سے اس انداز میں خطاب کرنے کی جسارت کی۔ والیٔ یمن کو حکم بھیجا گیا کہ محمدؐ کو گرفتار کر کے دربار خسروی میں پیش کرو۔ لیکن اسی وقت دربار الٰہی سے ایک اور حکم جاری ہو چکا تھا اور احکام خداوندی تو بہر حال اپنے وقت پر پورے ہو کر رہتے ہیں۔ جلد ہی پرویز خود اپنے بیٹے کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔

اسی قسم کا ایک مکتوب نبوی قیصر روم کو بھی بھیجا گیا لیکن جب حضورؐ صلعم کا ایلچی واپس آ رہا تھا تو اہل شام نے اسے لوٹ لیا۔ ایک اور ایلچی جو اسی طور پر والیٔ بصرہ کے نام دعوت اسلام لے کر روانہ ہوا قتل کر دیا گیا۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ۹ھ میں رومیوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر مقابلے کے لئے تبوک تشریف لائے لیکن

رومی اپنے جارحانہ عزائم کو عمل میں نہ لا سکے۔ بایں ہمہ رومی سلطنت کی طرف سے حملے کا خطرہ بدستور قائم رہا۔ آخر کار جب اس خطرے کا مقابلہ ضروری ہوگیا تو ۱۱ھ میں حضورؐ نے ایک فوج شام کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت اسامہؓ بن زید اس فوج کے سردار مقرر ہوئے لیکن اب رسولِ خداؐ کے لئے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملنے کی ساعت قریب آ پہنچی تھی، اسامہؓ بن زید کی فوج نے مدینے سے کوچ نہیں کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت کیفیت یہ تھی کہ عرب کو ایک طرف شمال اور دوسری طرف مشرق کی ہمسایہ طاقت سے حملے کا خطرہ ہر وقت لگا ہوا تھا۔ قیصر و کسریٰ دونوں کا بغض مسلمانوں کے درپئے آزار تھا۔ حضرت اسامہؓ بن زید جو مہم شام کو لے کر گئے اس کے بعد خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کو چاروناچار عراق کی طرف ایک اور مہم بھیجنی پڑی۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی جس کام کا آغاز انہوں نے کیا تھا اس کی تکمیل فاروقِ اعظمؓ کے ہاتھوں ہوئی۔

حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت کے محاربات میں سے اگرچہ کسی میں بھی بذاتِ خود شریک نہ تھے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر بڑے معرکے میں عساکرِ اسلام کی نقل و حرکت خود حضرت عمرؓ کے اشارے سے عمل میں آتی رہی۔ مسلمانوں کو جو فتوحات نصیب ہوئیں ان میں بلاشبہ فاروقِ اعظمؓ

کی تدبیر جنگ کا بہت بڑا حصہ تھا خلافتِ فاروقیؓ کے محاربات کی تفصیل اس موقع پر غیر ضروری ہے لیکن ان محاربات کے بعض نمایاں پہلو ہمارے موجودہ حالات میں خاص توجہ کے قابل ہیں۔ اس سلسلے میں جنگ قادسیہ کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ جنگ تاریخ عالم کی ان فیصلہ کن اور معرکۃ الآرا جنگوں میں سے ہے جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یوں تو ہر جنگ دنیا کے جغرافیائی اور کسی حد تک سیاسی، نقشے میں تغیر و تبدل کا موجب ضرور ہوتی ہے لیکن جنگ قادسیہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ایران کو پارہ پارہ کر کے اقوام مشرق کی تقدیر کا رخ پلٹ دیا۔

جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا آغاز ہوا تو عراق کی مہم جاری تھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات پر جنگی کارروائی تھوڑی دیر کے لیے رک گئی لیکن حضرت عمرؓ نے بہت جلد اپنی توجہ عراق کی مہم پر مبذول کی۔ اس توجہ کا پہلا نتیجہ سنہ ۱۴ھ میں جنگ بویب کی صورت میں ظاہر ہوا جہاں مسلمانوں نے اہل عجم کو شکست فاش دی۔ اس شکست پر اہل عجم کے دل میں غصے اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اب انہوں نے طے کر لیا کہ جو ہو سو ہو مسلمانوں کو ختم کر کے رہیں گے۔ اسی جذبے کے ماتحت انہوں نے ایک زبردست فوج جمع کی اور اس فوج کا سالار ایک ایرانی سردار رستم کو مقرر کیا۔

جب ایران ان جنگی تیاریوں میں مصروف تھا اس وقت عرب کی

کیفیت بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں کے لئے بویب کی جنگ محض دفاعی تھی جارحانہ نہ تھی۔ چنانچہ فتح بویب کے بعد فاروقِ اعظمؓ کی طرف سے فوجوں کو یہ احکام گئے کہ اپنی سرحدوں پر لوٹ آئیں۔ حضرات، ذرا اس نکتے پر غور فرمایئے کہ خلیفۂ اسلام نے فتح مند فوج کو پیش قدمی کا نہیں، بازگشت کا حکم دیا، صرف اس لئے کہ جنگ بویب فتح ایران کے لئے نہیں بلکہ دفاعِ عرب کے لئے لڑی گئی تھی اور اس سے غرض محض حفاظتِ دینِ متین تھی نہ کہ جوعِ الارض۔ فتح مند فوج کی اس ظاہری پسپائی نے دربارِ عجم کے جارحانہ عزائم کو اور برانگیختہ کیا اور ایرانی بڑھ بڑھ کر مسلمانوں پر وار کرنے لگے۔ اس حالت میں بھی کچھ عرصے تک حضرت عمرؓ کے سخت احکام نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔ ناچار مسلمانوں کا ایک وفد بارگاہ خلافت میں حاضر ہوا کہ پیش قدمی کی اجازت دی جائے تاکہ عجمی حملہ آور کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ سرولیم میور جیسے دشمن اسلام انگریز مورخ نے بھی اس معاملے میں خدا لگتی کہی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں — "اب (مسلمانوں کے لئے) اپنے دفاع کی صرف یہی صورت رہ گئی تھی کہ سلطنت ایران کو ختم کر کے اس تمام علاقے پر اپنا اقتدار قائم کریں۔" آخر حضرت عمرؓ نے اہلِ ایمان کو از سرِ نو دعوتِ جہاد دی۔ جلد ہی بیس ہزار مسلمانوں کا لشکرِ جرار سعد ابن ابی وقاصؓ کی قیادت میں روانہ کیا گیا مگر انہیں ہدایت تھی کہ پہل نہ کریں بلکہ قادسیہ

میں دشمن کے حملے کا انتظار کریں۔ قادسیہ مدائن سے (جو اس وقت سلطنت ایران کا پایۂ تخت تھا) تیس چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ایرانی سپہ سالار رستم، اس وقت ساباط کے مقام پر تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک مسلمانوں پر حملہ کرنے میں تامل کرتا رہا۔ لیکن جب شہنشاہ یزدگرد نے اسے مجبور ہی کر دیا تو وہ ساٹھ ہزار فوج لے کر قادسیہ کی طرف بڑھا۔ اب بھی اس نے معرکہ آرائی سے گریز کیا اور مسلمانوں کو پیغام بھیجا کہ صلح کی گفت وشنید کے لئے ایک وفد بھیجدیں۔ چنانچہ مغیرہؓ کی سرکردگی میں ایک وفد رستم کے پاس پہنچا۔ رستم نے مغیرہؓ کو ایک رقم خطیر اس شرط پر پیش کرنے کا وعدہ کیا کہ عساکر اسلام پیچھے ہٹ جائیں تاکہ اسے یہ ڈینگ مارنے کا موقع مل جائے کہ مسلمان پسپا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ مغیرہؓ نے اس غیر شریفانہ پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ دوسری صبح رستم نے اپنی فوج کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ تین دن اور تین رات میدان کارزار گرم رہا اور پھر عجمی فوج کے پاؤں کیا اکھڑے، عجمی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ جلد ہی پوری سلطنت ایران خلافتِ اسلام کے زیر نگیں تھی۔

حضرات آپ کو معلوم ہے کہ جنگ یرموک نے اسی انداز میں رومی طاقت کا خاتمہ کر دیا اور بالآخر شام کا پورا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا یرموک کی فتح سے پہلے دمشق اور حمص جیسے شہروں پر مسلمانوں کا

فاتحانہ قبضہ ہوا اور رومی فوجیں بتدریج اس علاقے سے پسپا ہوتی گئیں۔ میں ان فتوحات کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ ان کے ضمن میں جو معرکے ہوئے وہ اسلام کے قانونِ جنگ کے نفاذ کا روشن نمونہ تھے۔ یہ قانون رسول اللہ نے وضع فرمایا تھا اور ان کے خلفاءؓ نے جوں جوں موقعے پیدا ہوتے رہے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے کہ رسول اللہؐ نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو فوج کے ساتھ روانہ کرتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی

اغزوا جمیعًا فی سبیل اللہ فقاتلوا من کفر باللہ ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیداً ولا امرأۃً فھذا

عھد اللہ وسیرۃ نبیہ فیکم۔

فاروق اعظمؓ کی طرف سے سپہ سالارانِ اسلام کو جو ہدایات جاری ہوئیں ان کا مضمون دیکھئے تو وہ اسی منقولہ بالا ارشاد نبویؐ کا عکس معلوم ہوتا ہے میں "عیون الاخبار" کے ایک اقتباس کا ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

بسم اللہ وبعونہٖ۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مدد اور فتح کے ساتھ قدم بڑھاؤ۔ استقامت و استقلال کی راہ پر جمے رہو۔ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے لیکن زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست

نہیں رکھتا۔

جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو بزدلی نہ دکھاؤ
جب تم دشمن پر غالب آجاؤ تو قطعِ اعضا نہ کرو۔ جب تمہیں
فتح حاصل ہو تو تجاوز نہ کرو۔ بوڑھوں اور عورتوں اور بچوں کو
قتل نہ کرو بلکہ ان سے پہلوتہی کرو اس وقت جب فوجیں
باہم لڑ رہی ہوں اور جب فتح کے نقارے پر چوٹ پڑ رہی ہو
اور جب بار بار حملے کئے جا رہے ہوں مالِ غنیمت میں دھوکا نہ
کرو۔ جہاد کو فوائدِ دنیوی سے پاک رکھو (اللہ تعالیٰ سے)
تمہارا جو میثاق ہے اسی میں مطمئن و مسرور رہو۔ یہی بڑی
کامیابی ہے۔"

عام سپاہی سے لے کر سپہ سالار تک تمام مجاہدین حضرت عمرؓ کی جاری کردہ ہدایات کی تعمیل میں اس قدر محتاط تھے کہ افواجِ اسلام کے طرزِ عمل نے دنیا کی عسکری تاریخ میں ایک نئی مثال قائم کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں یہ فوجیں پہنچیں عوام نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا ایسی صورتیں بھی پیش آئیں کہ مفتوحہ شہروں کی آبادی نے مسلم سپہ سالاروں کو اس معرکہ آرائی میں ہر طرح کی مدد بہم پہنچائی۔ اس سلسلے میں قیصرِ روم کے دربار کا ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جب مسلمان دمشق اور حمص کو فتح کر چکے تو ہرقل نے

اپنے جرنیلوں اور درباریوں کو یہ کہہ کر غیرت دلائی کہ "اہلِ عرب تعداد، فوجی طاقت اور سازوسامان، غرض ہر لحاظ سے تمہارے مقابلے میں کم ہیں۔ لیکن ہر معرکے میں اگر شکست فاش ہوتی ہے تو تم کو!" اہلِ دربار میں سے ایک بڈھے امیر نے جواب دیا۔ "یہ سب درست ہے لیکن اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اہلِ عرب کا پلہ بہت بھاری ہے۔" اس جواب نے قیصر کو اور برہم کر دیا اور اس نے عظیم الشان پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ نتیجہ جنگ یرموک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن اس جنگ سے پہلے ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے بین الاقوامی معاملات میں ایک ایسا معیارِ عدل قائم کر دیا کہ دورِ حاضر کا تمدن اپنے ادعائے تیز رفتاری کے باوجود، تیرہ صدیاں گزر جانے پر بھی ابھی اس منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ صورت یہ ہوئی کہ معرکۂ یرموک سے پہلے مسلمانوں نے مصالحِ جنگ کے پیشِ نظر شہر حمص کو خالی کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر حضرت ابو عبیدہ رضی نے جو امیرِ عساکر تھے اپنے خزانہ دار کو طلب کر کے حکم دیا کہ حمص کے مسیحیوں نے جو رقم بطور جزیہ ادا کی تھی وہ لوٹا دی جائے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی کا استدلال یہ تھا کہ جب ہم اہلِ حمص کی حفاظت جان و مال کا ذمہ نہیں لے سکتے تو پھر جزیے پر ہمارا کوئی حق نہیں رہتا۔ مسلمانوں کے اس خلقِ عظیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی افواج کے رخصت ہونے پر اہلِ حمص ماتم کرتے تھے، زار و قطار روتے تھے دعائیں کرتے تھے کہ خدایا، مسلمانوں کو اس شہر میں دوبارہ لا! حمص کے یہودی

اس معاملے میں ایک قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے حلف اٹھایا کہ مسلمانوں کے سوا شہر کو کسی اور کے حوالے نہ ہونے دیں گے۔

مفتوحہ علاقے میں ان عدیم المثال واقعات کا ظہور اس لئے ہوا کہ شام کے یہود و نصاریٰ کو جن مجاہدین اسلام سے واسطہ پڑا ان میں سے اکثر غزوات نبویہ میں شریک رہے تھے اور غزا میں رسول اللہ کے اسوہ حسنہ سے سبق اندوز ہو چکے تھے۔ اسلام کے بدترین دشمن بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ رسول اللہ کی زندگی میں کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ فتح کے بعد مفتوحین کے قتل کی اجازت دی گئی ہو۔ درآں حالیکہ اس زمانے کے حکمرانوں کا یہ عام دستور تھا کہ مفتوحہ شہروں کی آبادی کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ فتح مکہ، بعد کی تمام اسلامی فتوحات کے لئے ایک زندہ و تابندہ نمونہ بنی، مسلمانوں نے اہل مکہ کے ہاتھوں یہاں برسوں تک طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں لیکن جب رسولِ پاک فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے تو اہل مکہ کے لئے ان کا اعلان یہ تھا۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ

تمام خطا کار اور پرانے مجرم عفوِ عام کے اس اعلان سے مستفید ہوئے حضور رحمۃ اللعالمینؐ نے رواداری و رحمت کی جو مثال اس طرح قائم کی تاریخ کے اوراق اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

حضرات! یہاں میں آپ سے ایک جملۂ معترضہ کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ ان معاملات میں اسوۂ رسالتؐ کا ذکر ایسا نہیں ہے کہ اس ایک مختصر اشارے میں آپ کی یا میری تشفی ہو جائے۔ رسولِ کریمؐ کے غزوات کی تہ میں کوئی جنگ جویانہ تحریک نہ تھی۔ ان کا سبب محض دفاعِ دین و امت کا جذبہ تھا اور کیوں نہ ہوتا جب خدائے تبارک تعالےٰ نے قرآن پاک میں جہاد کی تلقین کرتے ہوئے واضح الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔

پھر فرمایا ہے:۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔

جن لوگوں کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے بیشک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔"

اس آیہ مبارکہ کے متعلق اکثر مفسرین بالخصوص حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ جہاد کے مسئلے پر یہ پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی۔ یہ آیت اس

حقیقت کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ اسلام کا تصورِ جنگ دوسروں کی
املاک و آراضی پر خودغرضانہ تغلب کی اجازت نہیں دیتا۔ جہاد دراصل نام ہے
ملک و ملت کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہونے کا۔ جنگ جوئی اور حملہ آوری
کا خیال تک اسلام کی فطرت کے خلاف ہے۔ حرص وطمع کی ذرا سی
ملاوٹ بھی جہاد کی پاکیزگی اور مجاہد کے عزّو شرف کو آلودہ کر دیتی ہے۔
جہاد کا یہ تصور اس قدر رفیع الشان اور پاک ہے کہ اس پر خردہ گیری کی
کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ پھر بھی بھارت کے بعض ودّیا دان پنڈت جہاد
کے اس اسلامی تصوّر پر چراغ پا ہو رہے ہیں اور اسلام سے ناراض ہیں۔
بھارت کے پردھان منتری کو شکایت ہے کہ پاکستان کے "ذمہ دار"
حضرات بھی "جہاد کا نام لیتے ہیں"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے اونچے عہدے
کے ساتھ اتنے گہرے جہل و بے بصری کا اجتماع اپنی مثال آپ ہے۔ ایک
طرف کشمیر کو زبردستی بھارت میں شامل رکھنے کے لئے آج کل یہ دلیل جاتی ہے
کہ بھارت میں "پانچ کروڑ" مسلمان آباد ہیں اس لحاظ سے خود بھارت بھی
مسلمانوں کا ملک ہے۔ دوسری طرف "پانچ کروڑ" مسلمانوں کے اس
ملک کا وزیر اعظم اسلام کے بنیادی شعائر سے اتنا بے خبر ہے کہ اس نے
۲۹ جولائی کو دہلی کے ایک جلسۂ عام میں جہاد کے منصوص و مقدس فریضے
کے ذکر کو غیر ذمہ دارانہ گفتگو قرار دینے سے کوئی باک محسوس نہ کی۔ اہنسا کا

پرچار کرنے والے "باپو" کے اس روحانی بیٹے کو واضح رہے کہ اصطلاحِ قرآنی میں جہاد جنگ جوئی و خون آشامی کا نام نہیں، قیام امن کی نیت سے حملے کی مزاحمت کا نام ہے۔ شری نہرو فرماتے ہیں کہ پاکستان کے رہنماؤں کی زبان پر جہاد کا لفظ آیا، اس لئے بھارت کی توپوں کے دہانے پاکستان کی سرحدوں کی طرف پھیر دیئے گئے۔ بہ الفاظ دیگر پاکستان جب ملکی و ملی دفاع کی فکر کرتا ہے بھارت میں ذہنی خلفشار اور روحانی اضطراب کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

حضرات، پنڈت صاحب کا یہ استدلال قارئینِ قرآن کے لئے مقام عبرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب مسلمان اپنی حفاظت کے لئے میدان میں نکلتے ہیں تو اعدائے اسلام کے دلوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ

میرے نزدیک برعظیم پاکستان و ہند کی موجودہ صورتِ حال اسی آیہ کریمہ کی عملی تفسیر ہے۔ ستم یہ ہے کہ دفاع کے متعلق ہماری ہر جزا امن کوشش بھارت کے حکمرانوں پر کپکپی طاری کر دیتی ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ بھارتی فوجوں کے ہماری سرحد پر جمع ہو جانے کے بعد ہماری خواتین نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی تربیت لینی شروع کی۔ جن شہروں پر دشمن کی ہوائی گولہ باری کا امکان ہے ان میں احتیاطی تدابیر کی آزمائش کے لئے کبھی کبھی رات کو چراغ

بجھائے گئے۔ بھارت اس پر بھی بے چین ہو رہا ہے۔ ہر روز آل بھارت ریڈیو کی یہ فریاد کہسار میں چاروں طرف گونجتی ہے کہ لوگو! دیکھو پاکستان اپنے بچاؤ کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پنڈت نہرو کا دعویٰ یہ ہے کہ بھارت کی چار لاکھ سپاہ محض دفاع کے لئے پاکستان کی سرحدوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ اگر بھارت کا یہ فوجی اقدام محض دفاعی تھا تو وہ کون سا حملہ تھا جس کے خلاف دفاع کا یہ سارا سامان مہیا کیا گیا؟ یہ مسلم ہے کہ پاکستان میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کی گئی۔ پاکستانی سپاہ کے ایک حصے نے اگر سرحد کی طرف حرکت کی ہے تو صرف اس لئے کہ بھارت کی فوجوں نے اس سرحد کی طرف ایسی ہی جنگ جویانہ پیش قدمی کی تھی۔ یہ تمام سلسلۂ واقعات اولوالابصار کے لئے عجیب و غریب طور پر سرمایۂ عبرت بن گیا ہے۔

حضرات! مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آج پاکستان بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہے جو سرزمین عرب کو قیصر و کسریٰ کی افواج کے ہجوم کے وقت درپیش تھی۔ ہم اور ہمارے ارباب حکومت رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدینؓ کی خاکِ پا سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے لیکن ہم سب کو اپنی اس حیثیت پر بے انتہا فخر ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ پاکستانی سیاسیات کے ظاہر و باطن اور قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

کشمیر کے متعلق جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور وہی کریں گے۔ اس

سلسلے میں پاکستانی مدبرین کی زبان سے کبھی متضاد باتیں نہیں نکلیں اسلئے
کہ ہماری نیت صاف ہے۔ ہم شروع سے ہی کہتے آئے ہیں کہ کشمیر ایک
اسلامی ملک ہے جس پر بھارت نے دھوکے اور زبردستی سے ناجائز قبضہ کیا
ہے۔ پاکستان کے مسلمان اس ناجائز قبضے کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔
اس کے ساتھ ہمارے وزیر اعظم نے بار بار اعلان کیا ہے کہ دوسرے قضیوں کی
طرح ہم اس قضیے کا بھی امن پسندانہ اور منصفانہ حل چاہتے ہیں بخلاف اس کے
بھارت نے حق و صداقت کے عملی معیاروں کو منطقی حجت بازی اور قانون کی
من مانی تاویلات کی آڑ میں بار بار پس پشت ڈالا ہے۔ یہاں تک کہ آج بھارت
کے جارحانہ عزائم نے ایک بے انتہا نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اگر
بھارت اپنی طاقت کے گھمنڈ میں انصاف کا خون کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے
معلوم رہے کہ محمد رسول اللہ کی عزت پر کٹ مرنے والے،
قرآن پاک کو سینوں سے لگانے والے فاروق اعظمؓ کے نقش قدم پر چلنے
والے مسلمان پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بھارت کے حملہ آوروں کے جواب میں
ہم بھی اپنی تلواروں کو بے نیام کریں گے۔ اس صورت میں ہماری جنگ واقعی
جہاد کے نام کی مستحق ہو گی۔ ہمارے وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ہمارا بھروسہ
ہتھیاروں کی مدد پر نہیں خدا کی مدد پر ہے۔ دوسری طرف بھارت کے پردھان
منتری کو منکر خدا ہونے پر ناز ہے۔ پھر بھی میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ

وہ جہاد کی اسلامی شان کے اس نکتے پر غور فرمائیں جس کی تشریح لیاقت علی خاں صاحب نے کی ہے۔ ساتھ ہی میں بھارت والوں پر یہ واضح کردوں کہ قلت و کثرتِ تعداد کی بنا پر ان معاملات کا فیصلہ نہیں ہوا کرتا۔ تاریخ میں بےشمار شواہد بکثرت اس دعوے کی تائید میں موجود ہیں۔ اسلامی محاربات کی مثالیں انہیں شاید پسند نہ آئیں لیکن ان مثالوں سے قطع نظر قدیم یونان یا جدید امریکہ کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے BUNKER HILL اور MARATHON وہاں بھی کی مثالیں ان کی عبرت کے لئے موجود ہیں جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے ہمیں قرآن مجید کے ان الفاظ پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ

ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ کہ قرآن مجید کی یہ آیات پاک ہر وقت ہمارے پیشِ نظر رہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

اے ایمان والو! جب کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور خدا کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ ایسا کرو گے تو تم ہمت

ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر و ثبات سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

حضرات! میں نے اپنے معروضات اور متعلقہ ضمنی مباحث گوش گزار کرنے میں آپ کے اوقاتِ گرامی کا خاصہ حصہ لیا ہے لیکن موضوع کی وسعت اس سے زیادہ اختصار کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے کارناموں کے متعدد پہلو ہیں۔ پہلے ایک نو مسلم کی حیثیت سے، پھر ایک جلیل القدر صحابی کی حیثیت سے، اور آخر میں خلیفۃ الرسولؐ کی حیثیت سے آپؓ کی اسلامی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ میں نے چار و ناچار بعض اہم موضوعاتِ بحث سے قطع نظر کرنا ہی مناسب سمجھا ہے لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان عظیم الشان اصلاحات کی طرف اشارہ نہ کر دوں جو حضرت عمرؓ نے ملکی نظم و نسق کے مختلف شعبہ جات میں نافذ فرمائیں۔ یہ اصلاحات دنیا پر ایک مستقل اثر چھوڑ گئی ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے مطمح نظر کے لحاظ سے اس قدر دور رس تھیں کہ دنیا کے بعض ممالک ابھی تک اس منزل پر نہیں پہنچے جہاں ان کے لئے ان اصلاحات کا نفاذ عملاً ممکن ہو۔ مثلاً انتظامی اور عدالتی محکموں کی علیحدگی ہی کو لیجئے ایک مستقل محکمہ قضا کا قیام خود حضرت عمرؓ کا اجتہاد تھا اور پھر جونہی ملک کے نظم و نسق کو استحکام نصیب ہوا انہوں نے محکمہ قضا کو انتظامی شعبے سے الگ کر دیا۔

اسی طرح مملکتِ اسلام کی صوبہ وار اور ضلع وار تقسیم اور ہر صوبے اور ضلع کے لئے والی اور حاکم کا تقرر بھی فاروق اعظمؓ ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ ہی نے ایک ضابطہ وضع فرمایا جسے آج کل کی اصطلاح میں "ملازمانِ سرکار کے قواعدِ کارگذاری" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے مختلف سرکاری محکموں کے ملازمین کا معیار تنخواہ مقرر کرنے کے لئے واضح اصول نافذ فرمائے اب تک سرکاری کام مفت کیا جاتا تھا بلکہ جب تنخواہوں کا نفاذ ہوا تو بعض عہدہ داروں نے اصرار کیا کہ وہ بدستور مفت کام کریں گے کیونکہ اسلامی حکومت کی خدمت ان کے نزدیک ایک کارِ خیر تھی لیکن بالآخر حضرت عمرؓ ہی کی تجاویز پر عمل کیا گیا۔ صوبہ داروں کا فرض تھا کہ وہ اپنے تقرر کا پروانہ جو اصطلاح حال میں گویا "منشورِ ہدایات" تھا علی الاعلان پڑھ کر سنائیں تاکہ اگر ان سے فرائضِ مفوضہ کے ادا کرنے میں کوتاہی ہو تو عوام الناس ان سے باز پرس کر سکیں رشوت ستانی کے خلاف دو طرح کی احتیاطیں کی جاتی تھیں۔ ایک تو ہر صوبہ دار کو معقول مشاہرہ دیا جاتا تھا تاکہ طمع کا سوال باقی نہ رہے۔ دوسرے اس کے مامور ہونے پر اس کی تمام املاک کی مفصل فہرست تیار کی جاتی تھی اور یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ان املاک میں کوئی غیر متناسب اضافہ نہ ہو۔ حج کے موقع پر حضرت عمرؓ عوام وخواص کی شکایات سماعت فرماتے تھے۔ اس موقع پر تمام صوبہ داروں کی حاضری ہر سال مکہ مکرمہ میں لازم ہوتی تھی۔

حضرات! بلاشبہ خلافتِ فاروقیؓ کی یہ اصلاحات انقلاب آفریں ہیں۔ لیکن محکمہ مال گزاری کی تنظیم میری رائے میں حضرت عمرؓ کا اس سے بھی بڑا کارنامہ ہے۔ زمانۂ ماقبلِ اسلام میں اس قسم کا کوئی نظام موجود نہ تھا۔ فتح خیبر کے بعد یہودنے رسول اللہ سے درخواست کی تھی کہ انہیں ان کی اراضی پر بدیں وجہ متصرف رہنے دیا جائے کہ انہیں کاشت کاری میں خوب مہارت حاصل ہے۔ رسول اللہ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی تھی۔ یہود کا قبضہ زمین پر برقرار رہا اس شرط سے کہ بٹائی ادا کرتے رہیں۔ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ان پر عشر کے نام سے ایک محصول لگایا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے مختصر عہدِ خلافت میں اس مسئلے پر توجہ نہ فرما سکے اور خود حضرت عمرؓ نے جنگ یرموک کے بعد یہ معاملہ ہاتھ میں لیا۔ شروع ہی میں آپ کو ایک سخت انتظامی پیچیدگی کا سامنا ہوا۔ سپہ سالاروں کو اصرار تھا کہ ان کی خدمات کے عوض مفتوحہ ممالک کی اراضیات انہیں بطور جاگیر ملنی چاہئیں۔ حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ ان اراضیات کو بدستور ملک کے اصل باشندوں کے قبضے میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ جلیل القدر صحابہ میں اس مسئلے پر اختلاف رائے تھا مثلاً حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اور حضرت بلالؓ سپہ سالاروں سے متفق تھے بخلاف ان کے حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ فاروق اعظمؓ کے ہم خیال تھے۔

سلسلۂ بحث ابھی جاری تھا کہ حضرت عمرؓ کے ذہن میں قرآن پاک کی ایک آیت آئی جو ان کے نزدیک اس مسئلے پر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ آیت یہ تھی۔

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ

اور اس آیت کے ساتھ ہی جب وہ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ پر پہنچے تو اس آیہ طیبہ کی روشنی میں حضرت عمرؓ نے اس طرح استدلال کیا کہ مفتوحہ علاقوں کی اراضی میں آنے والی نسلوں کا بھی حصہ ہے پس اگر یہ اراضی فاتحین میں تقسیم ہو جائیں تو آنے والی نسلیں اپنے حق سے محروم ہو جائینگی۔ چنانچہ اس پر اتفاق رائے ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ تمام اراضی حکومت کی ملکیت قرار پائے گی لیکن قابض کا قبضہ برہم نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح زمین کی پیداوار پر لگان ناگزیر ہو گیا جس کی شرح حضرت عمرؓ نے فصلوں کی نوعیت اور متعلقہ اراضی کے رقبے وغیرہ کے لحاظ سے مقرر فرمائی۔

حضرات! آج کل پاکستان میں زرعی معاشیات کے مسائل اور عام زرعی اصلاحات پر غور و فکر اور بحث و تمحیص کا آغاز ہو چکا ہے۔ مسلم لیگ کے انتخابی منشور میں اس مسئلے کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے۔

"مسلم لیگ کا معاشی نظریہ بالکل واضح ہے۔ ہمارا نظریہ اسلامی جمہوریت اور مساوات کی اساس پر ہے۔ زرعی میدان میں مسلم لیگ کے نظریئے کے اطلاق کے معنی جاگیرداری کی تنسیخ اور اس

کاشت کار کے وقار، آزادی، خوشحالی اور اہمیت کا قیام
ہے جو خود زمین پر ہل چلاتا اور قوم کے لئے دولت پیدا کرتا ہے"

یہ عبارت بڑی خوش آئند اور شاندار ہے لیکن میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس منشور میں آگے چل کر جو لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے اس کا انداز بیان ایسا واضح اور غیر مبہم نہیں ہے جیسا ہونا چاہیئے تھا چنانچہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان تفصیلات کی تعبیر میں آگے چل کر بحث وجدل کی مزید گنجائش پیدا ہو جائے میں خود اس موقع پر زرعی اصلاحات کی بحث میں نہیں الجھ سکتا لیکن میرا یہ کہنا شاید بے محل نہ سمجھا جائے کہ اس مسئلے پر ارباب حل وعقد کو فاروق اعظمؓ کی جاری کردہ زرعی اصلاحات سے خالی الذہن رہنا چاہیئے۔ ان میں سے بعض کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ اس ذکر پر میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اس ضمن میں حضرت عمرؓ فاروق کا سب سے اہم اور نتیجہ خیز اقدام یہ تھا کہ انہوں نے زمینداری اور اراضی پر مالکانہ حقوق کے رائج الوقت قانون کو یک قلم منسوخ کر دیا۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

"رومیوں نے جب شام اور مصر فتح کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر کچھ افسران فوج اور کچھ اراکین دربار کو دے دیں، کچھ شاہی جاگیریں قرار دیں اور کچھ کلیسا کیلئے وقف کر دیں۔ اصل باشندگان ملک کے پاس کوئی زمین نہ

چھوڑی۔ ان کو صرف کاشتکاری کے حقوق حاصل تھے اور وہ بھی ایسے ذلیل طریقے پر کہ اگر مالک اس اراضی کو کسی اور کے پاس منتقل کرتا تو اراضی کے ساتھ کاشتکار بھی منتقل ہو جاتے تھے۔"

جوں ہی ملک خلافتِ اسلام کی تحویل میں آیا فاروق اعظمؓ نے اس وحشیانہ قانون کو منسوخ کر دیا اور ملک کے اصلی باشندوں کو وہ تمام زمینیں لوٹا دیں جو شاہی جاگیر میں شامل ہو گئی تھیں یا رومی امراء کے قبضے میں تھیں حضرت عمرؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک حکم نافذ فرمایا کہ کوئی مسلمان عہدہ دار، مصافی ہو یا غیر مصافی، ان اراضی کے خریدنے کا مجاز نہیں ہے اس زمانے کی جنگی مصلحتوں کے پیش نظر آپ نے یہاں تک کیا کہ عربوں کو کاشتکاری کی ممانعت فرما دی۔

حضرات! دولِ اسلامیہ میں دولت پاکستان کو جو مقام حاصل ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں، یہ قلمرو مسلمانوں کی قلمرو ہے اور اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ ہم نے بہت سی قربانیاں کر کے اسے اس لئے حاصل کیا ہے کہ اس سرزمین پر قانونِ الٰہی کا نفاذ ہو۔ ہماری مجلسِ قانون ساز نے قراردادِ مقاصد منظور کر کے اسی سمت میں پہلا قدم اٹھایا ہے، یہ قرارداد آگے چل کر ہمارے ملک کے آئین کا ماخذ ہیں لیکن ہمارے مقننین اور فقہا کے لئے

اجتہاد کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر میرا یہ بیان محتاج سند سمجھا جائے تو میں اس فرمان کا حوالہ دوں گا جو فاروق اعظمؓ نے قاضی شریحؒ کے نام اُس وقت جاری فرمایا جب آخرالذکر نے منصبِ قضا سنبھالا آپ کے الفاظ یہ تھے:۔

"مقدمات میں اوّل قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر قرآن مجید میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو سُنّتِ رسولؐ اللہ سے رجوع کرو اور اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر حدیث میں بھی کچھ نہ پاؤ تو اجماع (کثرتِ رائے) کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر کہیں پتہ نہ لگے تو خود اجتہاد کرو۔"

حضرات! آج کل ہمارا برِعظیم "دینی" اور "لادینی" طرزِ سیاست کی بحث کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بھارت کو اپنی لادینی سیاست مبارک ہو ہمارا مذہب توہمات کا مجموعہ نہیں ہے۔ ہمارے لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سے شرمسار ہوں۔ ہمیں اس دینِ حنیف پر فخر ہے کیونکہ یہ فطرت انسانی کی بلند ترین مقتضیات کو ابھارتا اور فروغ دیتا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمارا رسول صلعم دینی و دنیوی حیثیتوں کا جامع تھا اور نہ صرف اس کا اسوۂ حسنہ بلکہ اس کے صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کی زندگیاں اب بھی ہمارے لئے مشعلِ ہدایت بن سکتی ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ کی سیرت اس لحاظ سے خاص طور پر مشکوٰۃ نبوّت سے مستنیر تھی۔ آیئے ہم سب مل کر اسی نور سے لو لگائیں تاکہ پاکستان واقعی پاک لوگوں کی سرزمین بن جائے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا
وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج
وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ہ

(پاکستان پائندہ باد)

مقصدِ تعلیم

۱۹۵۲ء میں لاہور کی مشہور درسگاہ دیال سنگھ کالج کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس تقریب کی صدارت کے لیے خلیفہ شجاع مرحوم کو دعوت دی گئی۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے اس موقع پر جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا، وہ آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں خلیفہ صاحب نے بتایا ہے کہ تعلیم کا مقصد دراصل تربیتِ نفس ہے۔ انہوں نے مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ جب تک کسی قوم میں تربیتِ نفس کا عمل جاری رہتا ہے اس کی اخلاقی اقدار درخشندہ و تابندہ رہتی ہیں اور جب یہ عمل ختم ہو جاتا ہے تو وہ قوم اخلاقی لحاظ سے پستی کے عمیق غار میں گر جاتی ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے ہمارے معاشرے کی بعض شرمناک برائیوں کی نشان دہی کرنے کے بعد ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ جب تک تعلیم سے تربیتِ نفس کا کام نہیں لیا جائے گا اس وقت تک ہم مفید شہری اور سچے مسلمان نہیں بن سکیں گے۔

مقصدِ تعلیم

اسلام نے تحصیلِ علم کو جو اہمیت بخشی ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ رسولِ اکرم ؐ نے مسلمانوں کو عہدِ طفلی سے لے کر آرام گاہِ لحد تک علم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی۔ علم کو مسلمانوں کی میراثِ گم شدہ قرار دیا۔ اسے حدودِ ملکی سے بلند تر تصور کیا اور چین و ماچین تک پہنچنے کے فرمان صادر فرمائے۔ درحقیقت قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق خاکی انسان کو نوری فرشتوں پر فوقیت محض اس لئے حاصل ہوئی تھی کہ اسے قادرِ مطلق کی طرف سے علم کے نور سے بہرہ اندوز کیا گیا تھا اور اس نور سے فرشتے محروم تھے۔ اس درسگاہ کا اصولِ عمل بھی یہی ہے کہ دانشِ مشرق و مغرب کی تحصیل میں مصروف رہو۔ تحصیلِ علم کی اہمیت مسلم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ غایتِ تحصیلِ علم کیا ہے۔

تعلیم کی ضرورت بجا لیکن مقصدِ تعلیم کیا ہے۔ جن بزرگوں کا یہ ارشاد ہے کہ علم کو من حیث العلم حاصل کرو ہیں اُن سے کبھی متفق نہیں ہو سکا۔ ایسا کرنا میری نگاہ میں ایک قسم کی ذہنی عیاشی ہے۔

میرا خیال ہے کہ علم کی غایت تربیتِ نفس ہے۔ تربیتِ نفس کے دو مرحلے ہیں۔ ایک وہ مقام ہے جہاں ملت کے افراد کے شخصی کردار کی تربیت کی جاتی ہے۔ دوسری اور بلند تر منزل وہ ہے جہاں ملت کے افراد کے ملی شعور کو ابھارا جاتا ہے اور ان کے اجتماعی کردار کی تربیت کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم ملی شعور اور اجتماعی تربیت کو کہ غایتِ علم ہے نہایت اہم تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کا خطاب اکثر اقوام سے ہوتا ہے افراد سے نہیں۔ سچ یہ ہے کہ تربیتِ نفس کی اصل اسی اجتماعی شعور کی تربیت ہے جس کی بنا پر ملت کے افراد اپنے ذاتی مفاد کو ملی مفاد پر قربان کر دیتے ہیں۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ خدائے بزرگ و برتر مختلف قوموں اور گروہوں کو اسی وقت تک نوازتا ہے جب تک ان کے افراد اجتماعی شعور سے بہرہ یاب رہتے ہیں۔ ایسی ہی ملتوں کو توفیقِ عمل ارزانی ہوتی ہے۔ انہیں کو فاتح بحر و بر بنایا جاتا ہے — یہی نیابتِ الٰہی کا فرض انجام دیتی ہیں اور انہیں کے اعمال و افعال کو دیکھ کر انسان کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے کہ عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ وہ زندہ قومیں جن کا اجتماعی شعور بیدار ہوتا ہے اور جن کی ملی تربیت درست ہوتی ہے انفرادی

غلطیوں سے زیادہ ان غلطیوں کو اہمیت دیتی ہیں جن کے مضر اثرات اجتماعی نوعیت کے ہوں۔ تبھی اقبال نے کہا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

دور کیوں جائیے انگریزوں کے عروج و زوال پر غور کیجئے کبھی یہ بات ان پر صادق آتی تھی کہ ان کی مقبوضات پہ سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا لیکن یہ مقام ان کو اسی وقت حاصل رہا جب تک وہ اس نکتے سے آگاہ رہے کہ ان غلطیوں کو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا جو اجتماعی طور پر قوم کے لئے مضرت رساں ہوں۔ جب وارن ہیسٹنگز نے برصغیر ہند و پاکستان کے لوگوں پر ظلم توڑے تو انگریز قوم نے فوراً محسوس کیا کہ اس کا یہ فعل نہ صرف انفرادی طور پر مذموم ہے بلکہ اجتماعی طور پر بھی اس کے اثرات دور رس ہوں گے اور انگریزوں کی قوم من حیث القوم بدنام ہو گی۔ چنانچہ ہیسٹنگز پر مقدمہ قائم کیا گیا اور خود شعلہ بیان انگریز مقرروں نے کھلے اجلاس میں اس کے ظلم و ستم کی لرزہ خیز داستانیں بیان کر کے دنیا پہ یہ ثابت کر دیا کہ انگریز ناانصافی اور ظلم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر دیکھئے جب اسی قوم کا اجتماعی شعور ناقص ہو گیا اور تربیتِ نفس کی اقدار مٹ گئیں تو یہ ہوا کہ پہلے مینکل اوڈوائر، فرنک جانسن ڈائر اور ان کے ہم خیال انسان صورت درندوں نے ۱۹۱۹ء میں مارشل لا کے

نفاذ کے دوران میں پنجاب پر انسانیت سوز مظالم توڑے اور اس کے بعد جنکنز، ماؤنٹ بیٹن، اور ریڈ کلف نے تقسیم ہند و پاکستان کے سلسلے میں ہم سے جو وحشیانہ اور غیر منصفانہ سلوک کیا اس پر کسی انگریز نے صدائے احتجاج بلند نہ کی کجا یہ کہ ساری قوم ان لوگوں سے محاسبہ کرتی جو اپنی ملت کی بدنامی کا باعث ہوئے تھے۔ ان باتوں کا نتیجہ کیا نکلا کہ جان بل جس کی طرف کبھی تمام کمزور ممالک کی نگاہیں اعانت کی امید میں اٹھتی تھیں اب وہی جان بل خود دوسری قوموں اور ملکوں کا دست نگر ہے۔ چند ہی سال میں ہندوستان جیسا ملک جو سونے کی چڑیا کہلاتا تھا ہاتھ سے نکل گیا اور اب ایران اور مصر اور دوسرے ملکوں سے جو منفعت کی امید تھی وہ بھی منقطع ہو رہی ہے۔ ایسی ہی باتوں کی سزا خدائے بزرگ کی درگاہ سے ملا کرتی ہے اور اسی قسم کی غلطیوں کی بنا پر قومیں آمادۂ زوال و فساد ہو کر رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان تربیتِ نفس کی نعمتوں سے بہرہ یاب رہے انفرادی طور پر پاکباز اور فرمانِ الٰہی کے پابند رہے اور اجتماعی طور پر شخصی مفاد کو ملی مفاد پر قربان کر دینے کے لئے تیار رہے۔ اس وقت تک ان کی علمی تمدنی ملکی اور سیاسی فتوحات کا سیلاب کسی کے تھامے نہ تھم سکا۔ وہ عرب کے صحراؤں سے نکلے اور پہاڑوں کو کاٹتے اور ندی نالوں کو پاٹتے ملکوں پر چھا گئے مٹھی بھر مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی بنیادیں ہلا دیں محمد بن قاسمؒ

نے برصغیر ہند و پاکستان میں نہالِ اسلام کا بیج بویا۔ طارق ہسپانیہ کے مرغزاروں تک پہنچا۔ خالدؓ بن ولید نے رستم و اسفندیار کی داستانوں کو افسانۂ کہن بنا دیا۔ اقبال کہتا ہے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

یہ تو ملکی فتوحات کی داستان ہے۔ مسلمانوں کی علمی اور تمدنی فتوحات کا افسانہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ کیسے کیسے علماء اور حکماء مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ ابوریحان البیرونی، بوعلی سینا، محقق طوسی، عمرِ خیام، ابن رشد، رازی، غزالی، ابن تیمیہ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے کارنامہائے علمی کی بدولت یورپ، یونان کے فلسفے سے آگاہ ہوا۔ کچھ وہ ہیں جنہوں نے طب اور معقولات میں افرنگ کے استاد ہونے کا مقام پایا۔ مختصر یہ ہے کہ یورپ میں جس تحریک کو تحریکِ احیائے علوم کہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمانوں ہی کے ذوقِ عمل کا فیض ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی اور علمی اقتدار اسی وقت تک قائم رہا جب تک ان کا علمی اور اجتماعی شعور باقی رہا جب ان کی تربیتِ نفس کی اقدار مٹ گئیں اور افرادِ ملت کے مفاد پر شخصی مفاد کو ترجیح دینے لگے تو نہایت تیزی سے مسلمانوں کا زوال شروع ہوا۔ خلافت عباسیہ غداروں کی سازش سے برباد ہوئی۔ اجتماعی انتشار کی بنا پر مسلمان ہسپانیہ سے

نکلے۔ ہندوستان میں ملی وحدت کے پارہ پارہ ہونے سے اور اجتماعی شعور کے مٹ جانے سے جو کچھ ہوا اس کی دردناک داستان سے آپ سب آگاہ ہیں۔ دودمانِ چغتائی کے وارث گداگر ہو گئے۔ امرائے کبار کے خاندان سائل بن گئے، جاہ و جلال رخصت ہوا۔ عزت و آبرو خاک میں مل گئی۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

برصغیر ہند و پاکستان میں غدار باقی تمام ممالک سے زیادہ پیدا ہوئے میر جعفر اور میر صادق غداری کے درختِ زہرناک کے وہ پھل ہیں جن کی تلخی اب تک کام و دہن کو محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ کا فیصلہ اس امر میں ناطق ہے کہ اس برصغیر میں فرنگیوں کا بڑھتا ہوا اقتدار صرف غدارانِ ملت کا مرہونِ منت ہے۔ یہاں مسلمانوں کے ملی انتشار اور بے ترتیبی کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ حریت کی ہر تحریک کو خود اس ملک کے فرزند ہی کچل ڈالتے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جو نعرۂ حق بلند کیا اس کا حشر آپ کو معلوم ہے۔ بالاکوٹ کے افغانوں کے ماتھے پر جو کلنک کا ٹیکہ لگا ہوا ہے وہ تا قیامت باقی رہے گا۔ شاہ شہیدؒ نے انہیں کی غداری کی وجہ سے جام شہادت نوش کیا۔ اس کے باوصف اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے اگرچہ خدائے بزرگ کے احکام سے روگردانی اختیار کر لی۔ ہم نے خدا اور

اس کے رسولؐ کو بھلا دیا لیکن رحمت ایزدی نے ہمیں نہیں چھوڑا۔ یہ رحمتِ ایزدی اقبال علیہ الرحمۃ کی صدائے شعلہ ناک اور قائداعظم علیہ الرحمۃ کے ذوقِ عمل کی صورت میں نمودار ہوئی۔ قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی۔ آپ آگاہ ہیں کہ اس موقع پر بھی نامسلموں نے کیسے کیسے نکتہ طراز اور عالی مرتبہ مسلمانوں کا ایمان خرید لیا کہ وہ ہر طرح اس تحریک کی مخالفت کریں کیسے کیسے دلفریب روپ دھار کر ان غداروں نے اپنی ملت کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے بھی استشہاد کر کے نامسلموں کا غلام رکھنا چاہا۔ حتیٰ کہ

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں

ملکی کردار کی ذلت کا یہ آخری درجہ تھا جب غداروں کی ان حرکاتِ قبیح سے کچھ نہ ہوا اور پاکستان کا قیام ایک شکل میں معین نظر آنے لگا تو بھی غیروں کی آس نہ ٹوٹی۔ نامسلموں اور فرنگی حاکموں کو مسلمان غداروں پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں اور آسام میں رائے شماری پر اصرار کیا۔ انہیں یقین تھا کہ غدارانِ ملت ان مقامات میں مسلمانوں کو گمراہ کر کے انہیں نامسلموں کی غلامی پر آمادہ کر سکیں گے۔ مشیتِ ایزدی کو بھی منظور تھا کہ اس موقع پر ان ذلیل اور ملعون غداروں کی مساعی رائیگاں

جائے۔ لیکن لوگوں نے مسلمانوں کو برباد کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا اور اب بھی کشمیر کے معاملے میں نہرو ہٹ دھرمی کی بنا پر سیاست کا سب سے بڑا مہرا اپنے آپ کو اس خطاب سے موسوم کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا جو مسلمانوں میں ملی احیاء اور قومی ناموس کا ضامن تصور ہوتا تھا۔

حضرات! قیام پاکستان اور حصولِ آزادی کے بعد یہ امید بندھی تھی کہ مسلمانوں کا اجتماعی شعور کلیتہً بیدار ہو جائے گا اور افراد قوم اللہ کی اس بخشی ہوئی نعمت کی قدر کریں گے لیکن جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ آپ پر واضح ہے۔ آزادی کے لئے ہم نے اتلافِ جان کی مصیبت برداشت کی اور اس کے ساتھ ہماری آبرو خاک میں ملا دی گئی جس کی تفصیل بیان کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ پھر اس آبروریزی کی تلافی کے لئے کتنی آنکھیں ہیں، جو اشکبار ہوئیں۔ کتنے دل ہیں جو تڑپے۔ ان مظلوموں کا ذکر جانے دیجئے جن کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں قبضہ اغیار میں ہیں وہ تو ظاہر ہے کہ تڑپیں گے... لیکن ملت کے دوسرے افراد پر اس اجتماعی سانحہ کا کیا اثر ہوا۔ شاہ اسماعیل رح شہید نے ایک مسلمان عورت کو سکھوں کے قبضے میں دیکھ کر اپنے اوپر دنیا کی آسائش حرام کر لی تھی اور راہ خدا میں مجاہدانہ قدم بڑھایا تھا۔ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اپنی بے آبروئی کی تلافی کے لئے کوئی قدم اٹھایا! اور کتنے

ہیں جن کو اس امر کا احساس بھی ہے۔ حضرات! اگر ہمارے سر ندامت سے جھک جائیں اور ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے اعمال کا جائزہ لیں تو میں سمجھوں گا کہ میری آج کی تلخ نوائی رائیگاں نہیں گئی۔

تقسیم ملک کے بعد عام لوگوں نے جس اخلاقی ذلت، جس شخصی بے تربیتی اور جس اجتماعی شعور کے فقدان کا ثبوت دیا اس کا ذکر مورخ دا شگاف الفاظ میں کرے گا وہ لکھے گا کہ کم و بیش عوام الناس کے اور خواص کے ہر گروہ نے لوٹ مار اور غارت گری کو شیوہ بنایا اور نہ صرف احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی بلکہ ساری قوم کو بدنام کر دیا۔ ہماری سیاسی زندگی بھی ہماری بدنیتی کی آئینہ دار رہی ہے۔ چار سال کے قلیل عرصہ میں دو صوبائی حکومتیں معطل ہوئیں تین صوبائی حکومتوں کے ارباب کار کے خلاف پروڈا کی تحقیقات میں سنگین الزامات ثابت ہوئے۔ اور تو اور ایک صوبے میں تو وہ اَن ہونی بات بھی ہوئی جو کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی۔ یعنی عدالت عالیہ کے ایک رکن کے خلاف ایسے الزامات لگائے گئے جو اس سے قطع نظر کہ درست تھے یا غلط انتہائی ملی پستی کی دلیل ہیں یعنی درست ہونے کی صورت میں ملزم کی ذلت پر دال ہیں اور غلط ثابت ہونے کی صورت میں الزام لگانیوالوں کی پستی پر۔

تجارت کے معاملات میں دنیا کی منڈیوں میں ہماری ساکھ کو ختم کرانے

میں تاجر حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ناقص اشیائے خوردنی فروخت کیں۔
چور بازاری کو فروغ دیا۔ غریبوں کا خون چوس کر اور ذخیرہ اندوزی کر کے
اجتماعی مفاد پر ایسی ضربِ کاری لگائی کہ لوگوں کے زخم ابھی تک ہرے ہیں
پاکستان سے قیمتی مال جس پر ملکی اقتصادیات کا انحصار ہے یعنی پٹسن اور
سونا ہوائی جہازوں کے ذریعہ ناجائز طریقے پر برآمد ہوتا رہا۔ کیا اس سے بدتر
مثال قومی رہزنی کی کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس رہزنی کے مرتکب کوئی غیر
نہ تھے بلکہ خود پاکستان کے معتمد علیہ۔ گندم کی ناجائز برآمد کا جو نتیجہ نکلا ہے
وہ ظاہر ہے۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ جو ملک بفضلِ خدا اجناس و اشیائے
خوردنی کی فراوانی کے لئے مشہور ہو اس کے عوام ان حالات سے دوچار ہوں
خدائی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے محض ذاتی مفاد کی خاطر اجناس
کی ذخیرہ اندوزی کی جا رہی ہے اور لوگ دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔
اور جو چیزیں کھانے پینے کی میسر ہیں ان میں ملاوٹ کی یہ صورت ہے کہ
معاذ اللہ۔ دودھ اور گھی میں تو پہلے بھی تھوڑی بہت ملاوٹ کی شکایت
ہوا کرتی تھی مگر اب تو آٹا، نمک، چینی اور ہلدی بھی خالص شکل میں
اکسیر ہو گئی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی یہ کیفیت ہے کہ سرکاری ملازموں کی
رشوت خوری اور بددیانتی کی داستانیں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔
اور اگر ان داستانوں کا عشر عشیر بھی درست ہو جو آئے دن اخباروں

کے کالموں کو مزین کرتی ہیں تو تمام قوم کے لئے کس قدر ندامت کی بات ہے۔ عوام کا یہ حال ہے کہ تقسیم سے قبل جب ہندو سکھ یہاں موجود تھے تو اخلاقی تنزل اس حد تک نہ پہنچا تھا کہ سدِباب کے لئے خاص قانون کی ضرورت پڑتی۔ لیکن اب کہ اس صوبہ میں خالصتاً مسلمانوں کی آبادی ہے حکومت کو غنڈہ ایکٹ نافذ کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی ہی بہو بیٹیوں اور ماؤں بہنوں کو تنگ کر کے، گویا بزعم خود اپنی دلاوری اور بانکپن کا ثبوت دیتے ہیں۔ کاش! یہ بانکپن اس موقع پر کام آیا ہوتا جب مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کیا جا رہا تھا یا اب کام آئے کہ جو مظلوم عورتیں ابھی اسیر ہیں ان کی رہائی کی صورت پیدا ہو لیکن آج کل فہم و فراست کا انحصار اس بات پر ہے کہ دوسروں کو کامیاب دھوکہ دیا جائے۔ شرافت کا معیار یہ ہے کہ آپ کے پاس عالیشان کوٹھی اور اس سے زیادہ عالیشان موٹر ہو اور کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ نے کس طریق سے یہ چیزیں حاصل کیں۔ مسلمانوں کے ملی شعور اور قومی غیرت کے فقدان کی ایک اور صرف ایک مثال میں اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ہر چند کئی اور ایسی ہی مثالیں موجود ہیں۔ آپ سوچیں کہ ہماری پستی کس مقام تک آ پہنچی ہے۔

میاں سر فضل حسین نہ صرف پنجاب بلکہ کل ہندوستان کے مسلمانوں

کے سرکردہ رہنماؤں میں سے تھے۔ جب پنجاب میں کامیابی سے وزارت کے فرائض سرانجام دینے کے بعد وہ گورنر جنرل کی کونسل کے رکن مقرر ہوئے تو پنجاب کی یونینسٹ پارٹی نے جس کے وہ خود بانی اور کرتا دھرتا تھے ان کے اعزاز میں ایک الوداعی عصرانہ کا اہتمام کیا۔ میاں صاحب کی خواہش تھی کہ اس تقریب کے داعیوں میں بعض ایسے ہندو اصحاب بھی شامل کئے جائیں جو یونینسٹ پارٹی کے رکن نہ ہوں۔ انہوں نے اپنے متعدد کارکنوں کو ہدایت کی کہ اس غرض سے تین ہندو سرکردہ اصحاب یعنی رائے بہادر مکند لال پوری ایڈووکیٹ۔ رائے بہادر سوہن لال مالک مفید عام پریس اور رائے بہادر سیوک رام سے استصواب کیا جائے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ تینوں حضرات میاں صاحب کے ذاتی طور پر احسان مند اور دوسرے نسبتاً کم متعصب تھے مگر میاں صاحب کو اس معاملہ میں حیران کن مایوسی ہوئی۔ ان اصحاب میں سے ہر ایک نے میاں صاحب کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ پیش کش کی کہ وہ میاں صاحب کے اعزاز میں ایک علیحدہ دعوت کے کثیر اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں مگر کسی ایسے اعزاز میں شریک نہیں ہو سکتے جو صوبہ کی طرف سے ہو۔ کیونکہ شرکت کی یہ شکل نمائندگی کی علامت ہو گی اور یہ بات ہندوؤں کے مفاد کے خلاف ہو گی۔ اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ چند سال بعد سر شادی لال ہائی کورٹ لاہور کے چیف جج کے

عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ وہی سر شادی لال جس کی مسلم کشی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ اور جس کی اسلام سے دشمنی کی داستانیں اخبارات کے کالم سیاہ کر چکیں تھیں اور جس کے خلاف عام جلسے ہو چکے تھے۔ ان کے اعزاز میں بھی ایک تقریب کی داغ بیل ڈالی گئی۔ داعیوں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ کئی صفحے اس کے اندراج کے لئے ناکافی ثابت ہوئے اور پنجاب کا کوئی سر گروہ مسلمان نہ تھا اِلّا ماشاء اللہ جس کا نام اس فہرست میں نہ ہو۔ ان سب اصحاب کی شمولیت کی وجہ ذاتی مفاد تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ اس قوم فروشی سے دوسرے ہندوؤں کو خوش رکھ سکیں گے جن کا اقتدار ہائی کورٹ یا حکومت کے دوسرے محکموں میں تھا اور ان سے کوئی نہ کوئی ذاتی کام نکل سکتا تھا۔ یہ اس قوم کے نمائندوں کا حال تھا جس کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ اس کے افراد کا کھانا، پینا، سونا، جاگنا تک خدائے بزرگ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ہونا چاہیئے اور جس کو انفرادیت کے دائرے سے نکال کر ملی اور محض ملی حیثیت دے دی گئی تھی۔

میں نے پہلے عرض کیا تھا اور اب بھی عرض کرتا ہوں کہ یہ سب ناقص تعلیم کا قصور ہے۔ ہم نے مدرسوں اور مکتبوں میں تعلیم ضرور حاصل کی لیکن اس کی غایت سے غافل رہے۔ ممکن ہے کہ شخصی طور پر ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہوں جو اپنے معاملات میں پاکباز ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ

اجتماعی طور پر ابھی ہمیں تربیت حاصل کرنی چاہیے اور علم کی غایت کو سمجھنا چاہیے۔

موجودہ حکومت کو مطعون کرنے کے لئے بعض سیاسی جماعتیں برابر یہ پروپگنڈا کرتی رہتی ہیں کہ اس سلطنت میں شرع اسلامی نافذ نہیں ہے اور یہی معاشرے کی سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ میں ان سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جن معاملات میں شرع نافذ ہے اور جن معاملات میں شرع اور قانون رائج الوقت میں کوئی تصادم یا اختلاف نہیں ہے وہاں ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیا قانون رائج الوقت بددیانتی، دروغ گوئی اور معاہدہ شکنی کی تلقین کرتا ہے؟ کیا اس بارے میں ہم شرع اسلامی پر عمل پیرا ہیں — اسی قانون رائج الوقت کی حدود میں رہ کر نامسلموں نے کیسے کیسے مفید اجتماعی کارنامے سر انجام دیئے۔ سردار دیال سنگھ آنجہانی کو رائج الوقت قانون نے یہ نہ کہا کہ وہ اپنی تمام جائداد صدقات جاریہ کے لئے وقف نہ کریں۔ اسی قانون کی حدود میں رہ کر سر گنگا رام نے طبی درس گاہیں، مدرسے اور شفاخانے قائم کئے۔ ہاں! قانون رائج الوقت ہمارے مسلمان جاگیرداروں، نوابوں، رئیسوں اور کارخانہ داروں کو ضرور روکتا ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ ذاتی مفاد کے لئے لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں۔ انگلستان سے عالی نسب کتے منگواتے ہیں، پرتکلف دعوتوں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ میراثیوں، بھانڈوں اور طوائفوں پر اشرفیاں نچھاور کرتے ہیں۔ ان باتوں سے شرع ان کو نہیں روکتا لیکن قانون

رائج الوقت انہیں خیرات اور صدقات سے روکتا ہے۔ یہاں تک کہ انجمن حمایت اسلام، انجمن اشاعت اسلام اور مدرسۃ البنات جیسے ادارے بیش وکم دائماً مالی مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں۔

اس تلخ نوائی کے لئے پھر معذرت خواہ ہوں اور پھر بصراحت عرض کرتا ہوں کہ ان تمام خرابیوں کا علاج یہ ہے اور فقط یہ ہے کہ درسگاہوں، درکتبوں میں دانش گاہوں اور دانش کدوں میں تعلیم کا مقصد صرف یہ نہ سمجھا جائے کہ طلباء علوم و فنون سے آگاہ ہو جائیں بلکہ اساتذہ بہ نفسِ نفیس اپنی زندگی کا نمونہ بنا کر طلبا کے سامنے پیش کریں ساتھ ہی طلباء کو اس بات سے آگاہ کریں کہ کہ تعلیم کی غایت تربیتِ نفس ہے اور تربیتِ نفس کا اصلی مقام یہ ہے کہ آدمی شخصی مفاد کو اجتماعی فائدے پر قربان کر دے۔ اس سے زندہ قومیں پہنچتی ہیں اور دائمی زندگی کی معراج پر پہنچتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نصب العین کے حصول میں نہ صرف وہ تربیت مدد ہو سکتی ہے جو ماں کی گود یا تعلیمی اداروں میں حاصل ہو بلکہ ریڈیو سے بھی جو آج کل زیادہ تر رامش ورنگ سے لوگوں کو بہرہ اندوز کرتا ہے اور مساجد سے بھی جہاں جمعہ اور عیدوں کے خطبوں میں طاقت گویائی تمام کی تمام سیاسی اور بعض بے معنی امور پر صرف کی جاتی ہے۔ بہت مدد مل سکتی ہے کاش! ہمارے علماء ادھر متوجہ ہوں اور یہ سمجھیں کہ سب سے مقدم وہ شعور پیدا کرنا ہے جو ملتوں کی بقا کے لئے ضروری ہے اور جس کے

بغیر قوم ایک بے جان جسم بن کر رہ جاتی ہے۔ جب تک کسی قوم کا اجتماعی شعور زندہ رہتا ہے اور وہ ملی مفاد کو باقی ہر قسم کے مفاد پر تفوق عطا کرتا ہے اس وقت تک وہ قوم فنا نہیں ہوتی اور اگر دوسرے معاملات میں اس قوم سے غلطیاں ہو بھی جاتی ہیں تو مشیت الٰہی ان سے اغماض کر لیتی ہے کہ قوموں کی بقا کا یہی راز ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

یہی نشاں ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

تاریخ اور اُس کا دائرۂ بحث

۷ مارچ ۱۹۵۲ء کو لاہور میں "آل پاکستان ہسٹری کانفرنس" منعقد ہوئی تھی جس کا افتتاح گورنر پنجاب نے کیا تھا۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب مرحوم نے اس اجلاس میں ایک فاضلانہ خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمایا تھا جو آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے اس خطبے میں لاہور کی اسلامی تاریخ، تاریخ کی تعریف، تاریخ کا دائرۂ بحث، فلسفۂ تاریخ، فنِ تاریخ کا ارتقا، اور مسلمانوں کے فنِ تاریخ پر بڑے عالمانہ انداز سے بحث کی ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم کا یہ خطبہ ان اہل علم کے لئے رہنمائی کا کام دے گا جو تاریخ پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخ اور اُس کا دائرۂ بحث

زمانۂ گذشتہ میں برِ عظیم پاکستان و ہند کی تاریخ کو بالعموم اور تاریخ اسلام کو بالخصوص ایسے مصنفین نے شدید نقصان پہنچایا ہے جنہیں ہماری قوم سے کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ جو بعض صورتوں میں صریحاً ہمارے مخالف تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عرصۂ دراز تک طلباء کو ایسا مواد پیش کیا جاتا رہا جسے تاریخ کا نام دینا خود اس لفظ کی توہین تھی۔ اس نام نہاد تاریخ میں عمداً واقعات کی تحریف کی جاتی تھی اور مدعا یہ تھا کہ طبیعتوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو۔ بارہا اس حربے کا استعمال ہمارے خلاف کامیابی سے کیا گیا۔ یہ طریق کار اس حکمتِ عملی کا ایک جزو تھا جسے انگریز نے اپنے مخصوص نظامِ تعلیم کو اس ملک میں نافذ کرتے ہوئے پیش نظر رکھا۔ اس سلسلے میں لارڈ میکالے کی

شہرہ آفاق یا یوں کہئے کہ رسوائے زمانہ، روداد پر نگاہ ڈالئے تو ظاہر ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت کو کیا مقصد پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا گیا اور یہی مقصد کس طرح فی الواقع پیش نظر رکھا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہمیں استبداد کی آہنی گرفت سے نجات مل چکی ہے۔ اب ہم نہ صرف اپنی تعلیمی حکمت عملی کو ایک نئی راہ پر ڈال سکتے ہیں بلکہ ہمارے لئے یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ اپنے تاریخی سرمائے کو از سر نو مرتب و مدوّن کریں۔

اہل علم و دانش کی ایک مقتدر جماعت اس مہتم بالشان تقریب میں حصہ لینے کے لئے آج یہاں موجود ہے۔ اس جماعت کے تعاون سے یہ عین ممکن ہے کہ اس کانفرنس کو ایک ایسے سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کی داغ بیل ڈالنے کا موقع ملے جس کے ماتحت تحقیق کی رسائی اس عظیم تاریخی دفینے تک ہو جائے جو یا تو صدیوں تک نظروں سے اوجھل رہا اور یا اب تک غلط فہمیوں اور غلط نمائیوں کا بازیچہ بنا رہا۔ معلومات کا یہ چھپا ہوا خزانہ نئے مکتشفین کا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آفتاب حقیقت کے پرستاروں کا یہ اجتماع عالمانہ اور حکیمانہ تنقید و تفتیش کے اس تمام ساز و سامان سے آراستہ ہے جس کی اس موضوع اور اس کے متعلقہ اسلوب تحقیق کو ضرورت ہے۔

کانفرنس کے انعقاد کیلئے لاہور کا انتخاب

اس کانفرنس کے انعقاد کے لئے لاہور کا انتخاب محض حسن اتفاق پر محمول

نہ کرنا چاہیئے۔ یہ انتخاب کئی لحاظ سے نہایت موزوں انتخاب تھا۔ لاہور قدیم ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے اور پرانے ہندو تمدن کا گہوارہ ہے۔ اس کی تاریخ عہد ماضی میں بہت دور تک پہنچتی ہے۔ اسلامی افکار و اعمال کے مرکز کی حیثیت سے اسے اُس وقت سے اہمیت حاصل ہے جب نو صدیوں سے زیادہ عرصہ ہوا کہ سلطان محمود غزنوی کے مجاہدین کے لیئے ہندوستان نے اپنے دروازے کھولے۔ اس برعظیم میں اسلام کے سیاسی اور دینی نشو و نما کے ساتھ لاہور کے روابط بے شمار ہیں۔ اگر ایک طرف برعظیم کے پہلے مسلمان شاہی خاندان کا بانی سلطان قطب الدین ایبک یہاں محو خواب ہے (اگرچہ اس کے مرقد کا ماحول اس کی عظمت کے شایانِ شان نہیں ہے) تو دوسری طرف شہنشاہ جہانگیر اور اس کی نامور رفیقۂ حیات نور جہاں کو بھی اپنی آخری آرامگاہ یہیں راوی کے پار نصیب ہوئی۔ شہنشاہ عالمگیر کی بنائی ہوئی عظیم الشان بادشاہی مسجد بھی، نیز اکبر اعظم کا تعمیر کردہ قلعہ شہر کے لئے باعث زینت ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد دوسری عمارات اور یادگاریں ہیں جو سیاح کو اس ملک میں اسلامی عہدِ حکومت کی شان و شوکت کی یاد دلاتی ہیں۔ مسلمانوں کے سیاسی غلبے کے دورِ عروج کی ان نشانیوں کے ساتھ اس تاریخی شہر میں بعض نہایت جلیل القدر بزرگانِ دین اور مبلغینِ اسلام کے مقابر بھی موجود

ہیں۔ میری مراد حضرت داتا گنج بخش رح، حضرت میاں میر رح اور حضرت شاہ محمد غوث رح سے ہے جن کا خطۂ ارض میں محض وجود مقامی باشندوں کے لئے بے شمار برکتوں کا سرچشمہ ثابت ہوا اور جنہوں نے اپنی زندگی کی بے لوث پاکیزگی اور تقدس اور اپنی تعلیمات کی بے مثال سادگی کی کشش سے ہزاروں لاکھوں کو دین قیم کے دائرۂ رحمت میں شامل کیا۔

اسلام اور مسلمانوں سے لاہور کا تعلق محض عہدِ ماضی تک محدود نہیں ہے۔ یہ شہر اب بھی مسلمانوں کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم مرکز ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اسے بے عدیم المثال فخر نصیب تھا۔۔۔ کہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا عظیم الشان نقیب، چاردانگ عالم میں معروف حکیم الامت، شاعر بے بدل، ملت بیضا کے روشن مستقبل کی از سرِ نو تخلیق کرنے والا علامہ اقبال رح اسی زمین کو آسمان بنا رہا تھا۔ موت کے بے رحم ہاتھ نے یہ گوہر بے بہا بہت جلد ہم سے چھین لیا۔ اقبال رح جامع عالمگیری کے سائے میں ابدی نیند سو رہا ہے اور اب بھی جسمانی طور پر نہ سہی، روحانی طور پر ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کا پیغام آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ چراغِ ہدایت کا کام دیتا رہے گا۔

اس سے قطع نظر لاہور میں بعض کیفیتیں ایسی ہیں جو اسی شہر سے مخصوص ہیں۔ تعلیمی اور جامعی سرگرمیوں کے لحاظ سے اس کی یکتائی مسلّم ہے۔

پاکستان کی عظیم ترین، قدیم ترین اور اہم ترین یونیورسٹی، یعنی پنجاب یونیورسٹی لاہور میں قائم ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی سب سے بڑی تعداد اسی یونیورسٹی سے وابستہ ہے ان میں اسلامیہ کالج لاہور سب سے بڑا ہے جو انجمن حمایت اسلام کی تحویل میں ہے۔ انجمن حمایت اسلام ملک کا سب سے اہم مسلم تعلیمی ادارہ ہے۔ اسے قائم ہوئے ساٹھ برس سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس لحاظ سے یہ ملک بھر میں اپنی طرز کی سب سے قدیم ہی نہیں سب سے بڑی انجمن بھی ہے۔ لاہور کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان کے دو سب سے بڑے کتب خانے پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری اسی شہر میں ہیں۔ مطالعے اور علمی تحقیقات کی جو سہولتیں ان کتب خانوں میں میسر ہیں وہ اہلِ پاکستان کو اور کہیں حاصل نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لاہور اس لحاظ سے نہایت موزوں ہے کہ یہاں تاریخی تحقیقات کے لئے کسی ادارے کا قیام عمل میں آئے۔ میرے نزدیک کسی ایسے ادارے کا قیام ان اہم مقاصد میں سے ایک ہے جن پر اس کانفرنس کو غور کرنا چاہیئے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر مناسب یہی تھا کہ کانفرنس کا یہ اجلاس اسی مقام پر ہوتا اور میں خاص طور پر اس بات سے خوش ہوں کہ آج کی نشست میں ہم ان ذرائع پر غور کریں گے جو مطالعہ تاریخ میں ممد و معاون ثابت ہوسکیں۔

تاریخ کا دائرۂ بحث اور موضوع

تاریخ قدیم ترین علوم میں سے ہے اور اس کی قدر و قیمت اس لحاظ سے مسلّم ہے کہ اس کا شمار ذہنی تربیت کے بہترین ضابطوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بنیادی طور پر کوائفِ انسانی کا مطالعہ ہے۔ اس کی بوقلموں تعریفیں کی گئی ہیں:۔ "انسان کے متعلق حقائق کی فراہمی اور ان کا ارتقا" "بنی نوع انسان میں عملِ تغیر کا مطالعہ"۔ "انسان کے متعلق حقائق یا سبق کا مطالعہ"۔ "اپنے کارناموں کو منضبط کرنے کے لئے انسان کی کوششیں" "اقوام کی سوانح عمری"۔ نسلِ انسانی دراصل افراد کے مجموعے کا نام ہے اور تاریخ بجز اس کے کہ "انفرادی عمل کی یادداشت" ہے، اور کیا ہے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ بڑے آدمیوں کی تاریخ ہے۔ کارلائل کے نزدیک تاریخ بے شمار سوانح عمریوں کا نچوڑ ہے یہ شاید مبالغہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان اکابر کی زندگیاں جن کے افکار و اعمال نے قوموں کی تقدیر بنائی یا بدل ڈالی، آنے والی نسلوں کے لئے ایک مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ تاریخ وہ سبھی کچھ ہے جو انسان نے کہا، سوچا اور کیا۔ بنی آدم کی ساری زندگی معاشرت کا پورا عملِ ارتقا۔ تاریخ کو قوم سے وہی نسبت ہے جو حافظے کو فرد سے ہے۔

جس طرح حافظہ فرد کے لئے شعور کے تسلسل کا ضامن ہے اور اس کے ماضی و حال کے تجربات کو باہم منسلک کرتا ہے، اسی طرح تاریخ قوم کو نہ صرف اس کے ماضی کی واضح تصویر پیش کرتی ہے بلکہ اسے مربوط اور مسلسل زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جس امت کو اپنی روایات کا اہل ثابت ہونا ہے اسے ان روایات کا جاننا اور ان کی قدر پہچاننا لازم ہے۔ صرف تاریخ کا مطالعہ ہی اسے اس قابل بناتا ہے کہ اپنے ماضی کو معاشرہ انسانی کے دوسرے حصوں کی زندگی سے منطبق کر کے سمجھے۔ ان تصورات کا تجزیہ کر کے جنہوں نے اس کی زندگی کو آب و رنگ دیا اور ان مادی اسباب کا جائزہ لے جن کے ماتحت اسے عروج اور زوال نصیب ہوا کسی امت کے لئے صرف یہی ایک طریقِ کار ہے جس کے مطابق وہ اپنے سفرِ حیات کی اگلی منزل کا خاکہ تیار کرتی ہے۔

"تاریخ بنی نوع انسان کا عمل خود شناسی ہے۔ نسل انسانی کا شعور نفس ہے"۔ المانی مورخ ڈرائسن کے اس مقولے کی صداقت ہم پر روشن ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ان تحریکات کا مطالعہ کریں جنہوں نے مختلف اقوام کے نشو و نما میں مدد دی۔ شہنشاہ آسٹریا کو اس کے نفسیاتی اثر کا صحیح اندازہ تھا۔ جب اس نے چیک آبادی کے قوم پرستانہ جذبات کو دبانے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ پالیسکی کی لکھی ہوئی تاریخ بوہیمیا کی اشاعت کی راہ میں روڑے

اٹھائے۔ اسی طرح جب ٹریٹشکے نے جرمنوں کی قومی روح کو بیدار کرنا چاہا تو اس نے ان کی تاریخ مرتب کر کے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ اگر کسی قوم کے دل میں اس کے مستقبل کے متعلق کوئی نیا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس مورخ کی ضرورت ہے جو ان کے دل میں ان کے ماضی کے متعلق ایک نیا جذبہ پیدا کرے اور یہ حقیقت امتِ مسلمہ پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح کسی اور امت پر کہ اسے اپنے نفس کا شعور صرف اپنی تاریخ کے مطالعے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے امتِ مسلمہ کی تاریخ سے مراد یہی ہے کہ وہ اسلامی عقائد کے قوت سے فعل میں آنے کا بیان ہے۔

تاریخی تحقیقات کا نشوونما

مسلمانوں کے کسی اجتماع میں مطالعۂ تاریخ کی ضرورت و اہمیت پر زور دینا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر اس شجرۂ علم کی تاریخ پر سرسری سی نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے اس کے ارتقا میں نمایاں اور قابلِ فخر حصہ لیا۔ تاریخ کا آغاز واقعات کے بیان سے نہیں ہوا۔ اس کا پہلا ظہور شاعرانہ ادب میں ہوا جس کی قدیم ترین شکلیں لوک گیت اور رزمیہ نظمیں ہیں۔ یہاں بھی تاریخ صرف واقعات

کی طرف اشارہ کرنے تک محدود تھی اور یہ واقعات صنمیات اور داستان گوئی کے تہ بہ تہ پردوں کے نیچے دبے رہتے تھے۔ یہ شاعری جو ازمنۂ قدیمہ میں تاریخ نگاری کی قدیم ترین شکل ہے ادبی درجے کی تاریخ کے ظہور سے بہت پہلے مختلف اقوام میں معراج کمال کو پہنچ چکی تھی یونان کو ہیروڈوٹس سے پہلے ہومر نصیب ہوا اور روما کو ٹے سی ٹس سے پہلے ورجل۔ اٹلی میں میکیاولی سے مدتوں پہلے ڈینٹے کا ظہور ہوا۔ ہندوستان راماین اور مہابھارت پر ناز کر سکتا ہے لیکن اس کا دامن تاریخی ادب سے کلیتاً خالی ہے۔ روایت، دیو مالا اور قافیہ و وزن کی زنجیروں سے عہد قدیم کے دماغ کو آہستہ آہستہ ہی نجات مل سکی جس سے اس میں بتدریج یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ تاریخی معلومات کو صفائی اور صداقت سے بیان کر سکے۔

سب سے پہلے اہلِ یونان نے تاریخ کو ایک مستقل فن کے مرتبے تک پہنچایا۔ لیکن قومی تاریخ کا تصور رومیوں کے ہاں شروع ہوا ان کے قومی احساس کی شدت نے ان کے فنِ تاریخ نویسی کو متاثر کر کے لیوی اور ٹے سی ٹس جیسے مورخ پیدا کیے۔ یہ دونوں پہلے قومی مورخ ہیں جنہیں کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل ہے۔ پھر مسیحیت نے کلیسا کی تخلیق کی اور مذہب کو تاریخ کے سب سے زیادہ طاقت ور عوامل میں شمار کرایا۔ مسیحیت نے

لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ روحانی زندگی ہر دوسری قسم کی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ اسی احساس کے سہارے کلیسا کو سلطنت کے مقابلے میں زیادہ قوت مل گئی اور دوسری طرف خود سلطنت میں ضعف آنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ نویسی بہت بڑی حد تک اربابِ کلیسا کے ہاتھوں میں چلی گئی یہ صورتِ حال ناگزیر تھی کیونکہ ولیوں اور پاپاؤں کی سوانح عمریوں اور رہبانی سلسلوں کے احوال و کوائف کے بیان سے قطع نظر، عمومی یا نام نہاد سیاسی تاریخیں بھی اہلِ کلیسا، کلیسائی اصولوں پر لکھتے تھے۔ یورپ نے قرونِ وسطیٰ میں کوئی ایسی تصنیف پیش نہیں کی جو فلسفۂ تاریخ کہلانے کی مستحق ہو۔ یہ قدرتی بات تھی، اس لئے کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپی اہلِ قلم نہ صرف ان حقائق اور اسالیب دونوں سے بے بہرہ تھے جن پر ایک موزوں اور قابلِ قبول فلسفۂ تاریخ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے بلکہ وہ ان تاریخی حقائق سے بھی عہدہ برآ ہونے کے اہل نہ تھے جو انہیں خود اس زمانے میں میسر تھے۔ تاریخ کا پہلا لازمہ بداہتہً یہ ہے کہ ایسے حالات کی سچی کیفیت، پیش آمدہ واقعات کا صحیح صحیح بیان ہونا چاہیئے لیکن اس کے لئے پہلی شرط ایسی صفات کی موجودگی اور پھر ان کے استعمال پر قدرت حاصل ہونا ہے جن سے قرونِ وسطیٰ کا یورپی انسان بیگانہ محض تھا۔ وہ صفات کیا ہیں —؟

مشاہدے کی صلاحیت، تحلیل پسند ذہن، فراہم شدہ معلومات کو تولنے اور پرکھنے کی استعداد، تعصب سے پاک رہنے کی قابلیت اور نئے خیالات کو قبول کرنے کے لئے ذہن کو ہمیشہ مستعد رکھنے پر آمادگی۔ اس کے بجائے قرونِ وسطیٰ کا یورپی انسان انتہا درجے کا سریع الاعتقاد بے نقد و نظر اور متعصب انسان تھا۔ اپنی بے خبری سے بے خبر، وہ ہر وقت افسانے کو حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ رہتا تھا اور اپنے ماحول کے عام اندازِ خیال سے متاثر ہو کر وہ ہر واقعے کو کلیسائی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا خوگر تھا۔ چنانچہ غیر مسیحی زندگی کے متعلق کوئی ایسا تصور قائم کرنا جو اور نہیں تو کم از کم واجبی طور پر صحیح ہو، اس کے لئے کلیتہً ناممکن ہو گیا تھا۔

اسے دنیا کی خوش قسمتی سمجھئے کہ قرونِ وسطیٰ میں ایک اسلامی تمدن بھی نام نہاد مسیحی تمدن کے ساتھ موجود تھا اور اس کے علاوہ ایک اسلامی فن تاریخ نویسی بھی۔ یہ فن ایک خود رو فن تھا کیونکہ زمانہ ماقبل اسلام کے عرب میں تاریخی تالیفات کا کوئی وجود نہ تھا عربی زبان کی تاریخی تحریریں (اس اصطلاح کی صحت مفہوم کا لحاظ رکھتے ہوئے) اسلامی ادبیات کا ایک شعبہ ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ذات مبارک تاریخی دلچسپی کا پہلا موضوع بنی، اس کے لئے یہ ضروری ہوا کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ نیز ان تمام مغازی کے متعلق جن میں آنحضرتؐ

نے شرکت فرمائی۔ فراہم شدہ معلومات کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے اس سلسلے میں جو کامیابی ہوئی وہ محدثین کرام کی تفحص آمیز احتیاط و توجہ پر ہمیشہ شاہد و عادل رہے گی۔ ہر واقعہ عینی گواہوں اور ہم عصروں کے الفاظ میں روایت کیا جاتا ہے اور درمیانی راویوں کی ایک زنجیر کے ذریعے سے آخری راوی تک پہنچتا ہے۔ اس زنجیر کی ثقافت کا انحصار دو شرطوں پر ہے۔

(الف) زنجیر کا تسلسل،

(ب) یہ یقین کہ ہر روایت کنندہ بر بنائے حیات و اخلاق، قابل اعتماد ہے۔

مورخانہ تالیف کی یہ شکل اہلِ عرب میں اپنی مثال آپ ہے اور جدید فنِ تاریخ نویسی کے بنیادی لوازم کو پورا کرتی ہے۔ بایں معنی کہ یہ اندازِ تحقیق سند کی تلاش کو "سرچشمے تک" پہنچاتا ہے بلاشبہ ابتدائی تالیفات ایسے سوانحی مواد تک محدود تھیں جو بقیدِ سن و سال مرتب ہوتا تھا مگر جلد ہی اصل خیال نے ایک وسیع تصور کی شکل اختیار کرلی، علم آثارِ قدیمہ، علم الانسان اور جغرافیہ بھی تاریخ میں شامل کئے گئے اور اربابِ عقل و بصیرت نے اپنے آپ کو اس بغایت دلچسپ شعبۂ علم کے لئے وقف کر دیا۔ ابوالعباس احمد ابن جابر البلاذری کے ہاتھوں جن کا

انتقال تیسری صدی ہجری کے ربع آخر میں ہوا فنِ تاریخ نے ایک واضح ارتقائی منزل طے کی۔ لیکن اس شعبۂ علم میں مسلمان محققین کی ذہنی تنومندی کا جوہر مسعودی، البیرونی، ابن الاثیر، طبری (جسے عربی لیوی کا نام دیا جاتا ہے) مقری، مقریزی اور ابوالفدا کے زندۂ جاوید کام میں کھلا۔ یہ لوگ صرف ایک ہی علم کے ماہر نہ تھے بلکہ متعدد علوم و معارف کے جامع تھے۔ وہ مورخ بھی تھے اور فلسفہ و ریاضی و جغرافیہ کے عالم بھی!

ان میں شدید عظیم ترین شخصیت ابوزیاد عبدالرحمٰن ابن خلدُون کی تھی جس کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری کا ہے۔ ابن خلدون کی شہرت کی بنیاد اس مہتم بالشان علمی کارنامے یعنی اس کی "تاریخ عالم" پر قائم ہے۔ اس تاریخ کا مقدمہ بجائے خود بیش بہا معلومات اور فلسفیانہ فکر و تحقیق کا گنجینہ ہے۔ اس میں ابن خلدون، معاشرہ کی اصل، تمدن کے ارتقا، سلطنتوں اور شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی تشریح کرتا ہے اور من جملہ دوسرے امور کے قومی سیرت کی تشکیل پر آب و ہوا کے اثر کا مسئلہ بھی زیر بحث لاتا ہے ابن خلدون کے سوا شاید کسی اور شخص کو (اس اصطلاح کے موجودہ مفہوم کے لحاظ سے) تاریخی تنقید کی ماہیت کا واضح شعور اور اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس نے فلسفۂ تاریخ کی بنا ڈالی۔ وہ پہلا

شخص تھا جس نے دنیا کو تاریخی ارتقا کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو طبیعی اسباب اور معاشرتی مظاہر کا نیز ان روحانی قوتوں کا جو زندگی میں کارفرما ہیں صحیح مقام متعین کرتا ہے وہ اس وقت تک کی دنیا کا سب سے بڑا مورخ فلسفی تھا اور بحیثیت مجموعی اب بھی یقیناً دنیا کے عظیم ترین مورخین میں سے ہے۔ ابن خلدون کے متعلق اپنے بیان کو ختم کرنے سے پہلے مجھے یہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر رابرٹ فلنٹ کی رائے یہاں نقل کر دوں۔ پروفیسر موصوف کے متعلق یہ بدگمانی نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جنبہ داری سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"جہاں تک علم تاریخ کا تعلق ہے عربی ادب ایک ایسے انتہا درخشاں نام سے مزین ہے نہ تو یونان و روما اور نہ قرون وسطیٰ کی مسیحی دنیا میں کوئی ایسا نام ملتا ہے جو تابانی میں اس ایک نام کے قریب پہنچتا ہو۔ ابن خلدون (۱۳۳۲ء — ۱۴۰۶ء) کو اگر محض ایک مورخ کی حیثیت سے دیکھئے تو خود عربی مصنفین میں اس سے بلند تر ہستیاں موجود تھیں لیکن تاریخ کے مجتہد کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی ملک میں اس کا کوئی مثیل نہ تھا تا آنکہ ۳۰۰ سال بعد ویکو کا ظہور ہوا۔ افلاطون،

ارسطو اور آگسٹائن اس کے اقران و اماثل نہ تھے اور دوسرے سب اس قابل نہیں تھے کہ اُن کا نام تک اس کے ساتھ لیا جا سکے۔ اس کی اپج اور فراست، اس کی گہرائی اور گیرائی، ہر بات عجیب و غریب تھی لیکن وہ اپنی طرز کا ایک ہی انسان تھا۔ اپنے ہم مذہبوں اور ہم عصروں کے درمیان فلسفہ تاریخ کے شعبے میں اتنا ہی تنہا اور یکتا جتنا ڈینٹے شاعری میں اور راجر بیکن سائنس میں۔ اپنے ہم مذہبوں اور ہم عصروں کے درمیان بلاشبہ عربی مورخین نے وہ مواد جمع کیا تھا جسے وہ استعمال کر سکا لیکن وہی ایک شخص تھا جس نے یہ مواد استعمال کیا۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر قوم اپنے ماضی کی بہترین زندہ یادگار اور خود ہی اس ماضی کی بہترین شارح ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے تہذیب و تمدن کے ارتقا میں جو حصہ لیا وہ ہمارے لئے موجبِ فخر ہے اور اگرچہ اب انہیں متمدن دنیا کی سربراہی حاصل نہیں تاہم وہ صفحۂ ہستی پر ایک روشن اور نہ مٹنے والا نقش ثبت کر چکے ہیں۔ اب یہ مورخین کا کام

ہے کہ وہ دورِ ماضی کے خزائن کا سراغ لگائیں اور تحقیق و تفتیشِ علمیہ کے اس منصب کو از سرِ نو اختیار کریں جو نامساعد حالات کے باعث ترک کرنا پڑا تھا۔ تاریخ اسلام ہیں بالعموم اور تاریخِ پاکستان و ہند میں بالخصوص اہلِ بصیرت کی کنج کاوی کے لیے وسیع پیمانے پر گنجائش موجود ہے لیکن اس میدان میں اب تک گویا غیر مسلم مورخین ہی کا اجارہ رہا ہے جنھوں نے الا ما شاء اللہ معلومات کے اس بڑے ذخیرے کو جو موجود ہے، بہ غرض تشریح اور بہ طریق نقل استعمال کرتے ہوئے دانستہ یا نادانستہ بدسگالی اور غلط اندیشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کانفرنس پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی ہے، جس کے قیام کا مقصد "مطالعۂ تاریخ، بالخصوص تاریخ اسلام اور تاریخ برِ عظیم پاکستان و ہند کے مطالعے کو فروغ دینا" ہے۔ سوسائٹی نے بے شک ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے کہ ماہرینِ تاریخ کو ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے اور تاریخی تحقیقات کے سلسلے میں ان کی مساعی باہم مربوط کر دی ہیں۔ بایں ہمہ علمی تحقیق صرف سازگار ماحول ہی میں جاری رہ سکتی ہے، یہاں حکومت کی توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ کام کی قومی نوعیت و اہمیت بالکل واضح ہے۔ حکومت ہسٹاریکل سوسائٹی کو اس قابل بنائے کہ وہ علمی تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے ضروری سہولتیں میسر کر سکے۔ پہلی

شرط یہ ہے کہ اصل ماخذ تک محققین کی رسائی ہو۔ میری مراد ان بیش بہا ملفوظات سے ہے جن کا بڑا حصہ اس وقت یورپی اور ہندوستانی کتب خانوں کو مزین اور مفتخر کر رہا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے لیکن جو ذخائر ہندوستان اور بالخصوص مغرب کے کتب خانوں میں پڑے ہیں ان سے روٹوگراف نقلوں کی صورت میں صرف استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ کی تشکیلِ جدید اسی قسم کے ذرائع سے ممکن ہے ؛

عربی اور علومِ اسلامی

موتمر تعلیمات عربیہ اسلامیہ پاکستان کے زیرِ اہتمام ۹ مارچ ۱۹۵۲ء سے ۱۰ مارچ ۱۹۵۲ء تک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے حبیبیہ ہال میں ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے اس اجتماع کی صدارت فرمائی تھی۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ آئندہ صفحات کی زینت ہے۔ اپنے اس خطبے میں خلیفہ صاحب مرحوم نے ان اہم نکات پر زور دیا تھا کہ قیام پاکستان کے بنیادی تقاضوں کے پیشِ نظر ملک کے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور ایسا طریق کار وضع کیا جائے جس کے تحت ہمارے نصابِ تعلیم میں عربی زبان اور علومِ دینیہ کو ان کا صحیح مقام مل سکے۔

عربی اور علومِ اسلامی

علومِ عربیہ و اسلامیہ کی ضرورت اور اشاعت ایک دینی فریضہ ہے۔ اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس کے بغیر ہم پاکستان کو نہ تو اسلامی سلطنت کہہ سکتے ہیں اور نہ ان عزائم کو پورا کر سکتے ہیں جن کے لئے پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔

پاکستان کا حصول ہمیں اس لئے عزیز تھا کہ ہم اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی مخصوص روایاتِ ملی کی حفاظت کر سکیں۔

اگر ہماری حکومت "قرار دادِ مقاصد" کے بعد اپنے مجوزہ خطوط کے مطابق آئین مملکت بنالے اور ملک کے تمام طبقات اس کو تسلیم بھی کر لیں تو بھی یہ سلطنتِ خداداد سچے معنوں میں اسلامی سلطنت نہ ہوگی جب تک اس آئین کے الفاظ کو ملتِ اسلامیہ کے اعمال میں نہ ڈھالا جائے اس مقصد کے لئے

ہمیں لامحالہ اپنے علمی دینی اور تاریخی خزائن کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ قرآن حکیم، احادیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں اپنی عظمت کے ان نشانوں کو تلاش کرنا ہوگا جو ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے بطور ورثہ چھوڑے ہیں۔ یہ علمی خزانے عربی زبان میں ہیں اور ان تک پہنچ کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم علوم عربیہ اسلامیہ کی تحصیل و تدریس میں پوری تن دہی سے کام لیں۔

عربی زبان کو اُم الالسنہ کہا جاتا ہے اور یہ ہر لحاظ سے درست ہے خالق کائنات نے انسانیت کو رحمۃ اللعالمین ؐ کے ذریعہ اسی زبان میں پیغام ہدایت دیا۔ یہی وہ زبان ہے جس کی طبیعت ہر قسم کی آمیزش قبول کرنے سے پاک رہی۔ اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ ہر قسم کے مضامین اس میں سمائے ہوئے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف LITERARY HISTORY OF PERSIA، میں ذکر کیا ہے کہ کچھ اوپر بارہ سو برس تک اہل ایران اپنی مادری زبان کو بالکل بھلائے بیٹھے رہے اور اس کی جگہ علوم میں عربی استعمال کرتے رہے۔ عربوں کے پہلے حملہ کے بعد مکمل دو صدیوں تک عربی ایرانیوں کی علمی زبان بنی رہی۔ گو ایران میں عربوں کا قیام بہت مختصر تھا تاہم انہوں نے ایرانیوں کے خیالات اور ان کی زبان پر جس قدر گہرا اثر ڈالا وہ یونانی اثر سے کہیں زیادہ ہے۔ براؤن اس بیان کے بعد پروفیسر نولڈیکی کا یہ قول نقل کرتے ہیں :-

—— یونان کا اثر ایران کی معاشرت کی صرف سطح تک محدود رہا لیکن اس کے برعکس اسلام کا کلمۂ توحید اور عربوں کے طور طریقے ایران کی رگ و پے میں اثر کر گئے۔ ایک مغرب نژاد محقق کی یہ تصریحات ہمارے لئے سرمۂ دیدۂ عبرت ہیں۔

عربی زبان اپنی قدیم عظمت کے لحاظ سے دنیا کی دوسری زبانوں میں جو درجہ رکھتی تھی اس کے شواہد بے شمار ہیں لیکن آج بھی جب کہ عالمِ اسلام صدیوں سے حکومت و قوت سے محروم ہے یہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تمام اسلامی ممالک میں نہ صرف مسلمان بلکہ عیسائی اور دوسرے لوگ بھی عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح اپنائے ہوتے ہیں۔ حجاز تو خیر مِلِ بَیْنَنُ الْعِلُ کی برکات کا مسکن ہے۔ عراق، شام، مصر، ترکی، افغانستان، ایران، انڈونیشیا اور پاکستان ہر جگہ آپ مسلمانوں کو اس زبان کی برکت سے ایک "وحدت" میں منسلک پائیں گے اور اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ عربی وہ بین الاقوامی زبان ہے جس نے تمام عالمِ اسلام کو رشتۂ وحدت میں منسلک کر دیا ہے۔ حج کے ایام میں جب تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں تو وہ روح پرور مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ بے ساختہ عربی زبان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

آج اکابرِ ملت اور اربابِ حکومت کھلے لفظوں میں اعلان کر چکے ہیں کہ

قرارداد مقاصد کے بعد ہم پاکستان کو ایک ایسی سلطنت بنانا چاہتے ہیں جہاں اسلام کے اصولوں کے مطابق ہم حکومت کا وہ نمونہ پیش کر سکیں جس سے کمیونزم اور مغربی جمہوریت کی کشمکش میں ایک متوازن معتدل اور اسلام کا فعال اور زندہ نظامِ سیاست وجود میں آجائے۔ اس مقصد کے حصول میں ہماری کامیابی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ ہم اپنے تمام علمی ذخائر پر جو عربی زبان میں ہیں حاوی ہو جائیں۔

ان علمی اور لسانی ضرورتوں کے علاوہ اگر سیاسی اور ملکی ضرورتوں کو دیکھا جائے تو پاکستان کا استحکام اور "جمہور" کے جذبات کی ترجمانی اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ ہم اسلام کو اس کے اصل ماخذوں یعنی قرآن و سنت اور اس کے بعد تاریخ و سیر کی کتب کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت سے مذہبی اکابر کی طرح آگاہ تھے اور اپنے انداز میں انہوں نے کئی مرتبہ کھلے لفظوں میں اس کا اظہار بھی کیا۔ آپ حیدر آباد تشریف لے گئے تو چند نوجوانوں نے آپ سے کچھ سوالات کئے۔ یہ مکالمہ اورینٹ پریس کی وساطت سے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ آج اس مرحلہ پر اس کے چند اقتباسات بانیٔ پاکستان کی بصیرتِ قلبی اور دور رس نگاہ کی یاد تازہ کر دیں گے۔

آپ سے سوال کیا گیا۔

مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

آپ نے فرمایا:

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے میں نہ تو کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں

زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی بغرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن حکیم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور نا ممکن ہے۔"

آپ سے جب اشتراکی حکومت کے بارے میں رائے معلوم

کی گئی تو آپ نے فرمایا:

"اشتراکیت۔ بالشویکیت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا رابطہ اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔"

اسکے بعد ترکی حکومت کے متعلق حاضرین نے کہا کہ وہ ایک دنیوی ریاست (SECULAR STATE) ہے اور دریافت کیا کہ کیا اسلامی حکومت قائدِ اعظمؒ کے خیال میں اس سے مختلف ہوگی؟

آپ نے فرمایا:۔

ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز! سو یہ بالکل واضح ہے اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت

دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

یہ تھی غرض و غایت اس سلطنتِ خداداد کے قیام کی جسے ہم پاکستان کہتے ہیں اور جو تمام عالمِ اسلام کی واحد امید گاہ ہے بانیٔ پاکستان نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا، یہ آپ ان کے اپنے الفاظ میں سن چکے ہیں۔

آج اللہ کے فضل و کرم سے ہم ایک طویل جدوجہد کے بعد قائدِ اعظمؒ کے خواب کی زندہ تعبیر یعنی پاکستان کی شکل میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اللہ نے ہمیں موقع دیا ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنی دنیا آباد کریں اور جس طرح چاہیں اسے آراستہ کریں۔ لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ علوم اسلامیہ عربیہ جو ہماری تہذیب و تمدن کے مخزن ہیں کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔

فرنگی نظامِ تعلیم نے غلامی کے دَور میں جو زہر ہمارے خون میں ملایا تھا وہ آج بھی بدستور گردش کر رہا ہے، آج ضرورت ہے کہ ہم غلامی کی عمارت کو بنیادوں تک کھود ڈالیں اور اپنے قومی مزاج اور اپنی تہذیبی قدروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک نئی عمارت کی تعمیر کی کوشش کریں۔ اربابِ ملت، علمائے کرام اور زعمائے حکومت سب کا فرض ہے کہ وہ اپنے علمی

دفینوں کا جائزہ لیں، تمام جدید اور مفید علوم کو اپنا نصب العین بنا کر اور اُن کو قومی سپرٹ اور ملی جذبات سے تطابق دے کر ایک ایسا نظامِ تعلیم وضع کریں جو حالاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کو باوقار زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے۔

ہیں آخر میں اپنے مہمانوں کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ وہ ہم کو اس مقصدِ عظیم کی تکمیل میں کامیاب کرے اور یہ نشاطِ جدید کا سنگ بنیاد ثابت ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

طلبا کی ذمہ داریاں

۲۴ مارچ ۱۹۵۲ء کو گورنمنٹ کالج کیمبل پور کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے اس فاضلانہ خطبے میں خلیفہ صاحب مرحوم نے طلبہ کے متعدد پہلوؤں کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے مثلاً کھیل اور صحت جسمانی کی مشقیں ابھرتی ہوئی نسل کی ذہنی اور دماغی نشو و نما کے لئے بڑی ضروری ہیں۔ کسی امتحان میں ناکام ہو کر ہمارے نوجوانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ بعض دفعہ وقتی ناکامی کسی عظیم الشان کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ تعلیم کا مقصد دراصل ایسے شہری پیدا کرنا ہے جن کے دل و دماغ احساسِ شہریت سے مملو ہوں اور جو قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم رکھیں۔ ہمارے طلبہ بدنظمی کا شکار ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر ہڑتال کرنا ان کا معمول بن گیا ہے۔ یہ صورتِ حال یقیناً افسوسناک ہے۔ اس سلسلے میں طلبہ کے ساتھ ہم لوگ بھی بری الذمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں سے جو طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکل رہے ہیں ان میں لیاقت کا سخت فقدان ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟

طلبار کی ذمہ داریاں

ابھی تھوڑی دیر ہوئی پرنسپل صاحب نے نہایت دلچسپ اور خیال انگیز رپورٹ پیش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطالعہ کتب سے قطع نظر اس درس گاہ کے طلباء نے جو نمایاں امتیاز کھیل کے میدان میں حاصل کیا، وہ بھی اپنی جگہ مبارک باد کے قابل ہے۔ زندہ قوموں میں جو تنظیم اور مقابلے کی استعداد کھیل کے میدان میں پیدا ہوتی ہے اس کی تفصیل تحصیل حاصل ہے سیرت کو پختہ کرنے اور ان کے قویٰ کو بروئے کار لانے میں کھیلوں کے مقابلے اور باہمی مسابقت کے مواقع بہت بڑا حصہ لیتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی نظام میں کھیلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے باعث طلبا کی تنظیمی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور ان میں اقتدار اور رہبری کی قابلیت پیدا

کرتی ہیں۔ آپ کو وہ تاریخی مقولہ یاد ہو گا کہ واٹرلو کی جنگ کا فیصلہ ہیرو اور ایٹن کے کھیلوں کے میدانوں میں ہوا تھا۔ اس مقولہ کے پس پشت انگریزی نظام تعلیم کی وہ خصوصیت ہے جو کھیل اور کھیل سے پیدا ہونے والی تنظیمی خوبیوں کو سنجیدہ مطالعے اور اس کے شاندار نتائج کے برابر جگہ دیتی ہے۔ یہ خوبیاں ظاہر ہے کہ قومی کردار کی تعمیر میں ایک قابلِ قدر حصہ لیتی ہیں۔

یہاں ایک لمحہ کے لئے رک کر میں ایک نظر یونان قدیم کے دلچسپ کھیلوں کی روایات پر ڈالنا چاہتا ہوں جو اس عظیم الشان قوم کی جسمانی اور ذہنی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں اور جو ہمارے لئے ایک لحاظ سے ایک قابلِ قدر مثال پیش کرتے ہیں۔ کھیلوں میں حصہ لینے والے نوجوان مل کر سب سے بڑے یونانی دیوتا زیوث کے مندر میں حلف اٹھاتے تھے کہ وہ اپنے کھیلوں کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک و منزہ رکھیں گے۔ حیلہ جوئی سے کام نہیں لیں گے اور ہار جیت میں منصفین کے فیصلہ کا پورا پورا احترام کریں گے۔ پھر مقابلہ میں حصہ لینے والا ہر نوجوان دعا کرتا تھا کہ "اے زیوث دیوتا! اگر میں فی الحقیقت کامیابی کا حقدار ہوں تو تجھ سے فتح و نصرت کے لئے استمداد کرتا ہوں۔" فتح مندی حاصل کرنے کے لئے اہلیت کی یہ شرط اس اعتبار سے نہایت معنی خیز ہے کہ وہ نوجوانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں اہلیت حاصل کرنے اور پھر اپنے آپ کو حقدار سمجھنے کی تعلیم دیتی ہے۔

جن طلبہ نے آج انعامات حاصل کئے ہیں ان کو مبارکباد دیتے ہوئے میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ یہ کامیابی ان کو اس سے بھی اونچے امتیازات کے حصول میں مزید کوشش و کاوش کی تحریک کرے گی۔ ان کے حوصلوں کو بلندی اور ہمتوں کو توانائی بخشے گی تاکہ زندگی کے میدان میں وہ اس سے نمایاں امتیاز حاصل کر سکیں۔ نیز ان کے ان رفقاء کو جو پیچھے رہ گئے ہیں اپنی جدوجہد تیز تر کرنے کی ترغیب دے گی۔ اس قسم کی عارضی ناکامیوں سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ تعلیم کے میدان میں امتیاز حاصل نہیں کر سکتے لیکن زندگی کے آسمان پر درخشندہ ستارے بن کر چمکتے ہیں اور وطن و ملت کی رہنمائی کا بوجھ کامیابی کے ساتھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔

اس قسم کی تقاریب کا خاصہ بن چکا ہے کہ ان نوجوانوں کو جو ڈگریاں حاصل کرکے زندگی کی ذمہ داریوں سے ہمکنار ہونے والے ہیں کچھ نصیحتیں کی جاتی ہیں لیکن میں کوئی ایسا ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایسی نصیحت پر جو بے طلب پیش کی جائے کوئی شخص کان نہیں دھرتا اس کے برعکس اگر ایسے موقع پر جب طلبہ کے دل تعلیمی اسناد و اعزازات حاصل کرنے کی وجہ سے فطرتی طور پر باغ باغ ہوتے ہیں ان کو کسی پند و موعظت کا تختہ مشق بنایا جائے تو لوگ ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں حلبۂ

تقسیم اسناد کے صدر سے بھی اس قسم کی ہمدردی کا اظہار ضروری ہے۔ کیونکہ بادل ناخواستہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے وہ اس سے پہلے زیادہ دلکش انداز میں کہا جا چکا ہے۔ اس لیے میں اس نوزائیدہ مملکت میں تعلیم کی حالت پر تبصرہ یا اس نظام تعلیم کی خامیوں پر تنقید نہیں کروں گا، جو انگریز نے اپنے مفاد کے پیش نظر ہم پر ٹھونس دیا تھا اور جسے اب از سرِ نو تعمیر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ میں صرف چند ایسی باتیں آپ کے گوش گزار کرنے پر اکتفا کروں گا جن کا تعلق دو ایک ایسے مسائل سے ہے جو میرے زیر غور رہے ہیں اور اگر مجھے اجازت ہو تو میں عرض کروں گا کہ یہ مسائل آپ سب کی پوری توجہ کے مستحق ہیں۔

سب سے پہلا اور اہم سوال تو یہ ہے کہ آخر ہم تعلیم کیوں حاصل کرتے ہیں؟ میں تعلیم برائے تعلیم کا قائل نہیں ہوں اور نہ تعلیم کو مقصد بالذات سمجھتا ہوں۔ تعلیم کا اولین اور لازمی مقصد کردار کی تعمیر اور نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ پاکستان میں تو تعلیم کا مقصد اس مملکت کے زیادہ سے زیادہ شہریوں میں ان ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنا اور ان فوائد سے روشناس ہونا ہے جو ایک آزاد اسلامی ریاست کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔ عوام کی غیر تعلیم یافتہ اکثریت کے باوجود حکومت نے انتخابات کے لیے ہر بالغ کے حقِ رائے دہندگی کو

تسلیم کر کے اپنے عوام میں اور جمہوریت کے اصولوں میں بے پناہ اعتماد کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس دلیرانہ تجربہ کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار تعلیم یافتہ اقلیت کے اس احساس پر ہے جو غیر تعلیم یافتہ اکثریت کے لیئے اس کے دل میں پیدا ہو۔ اگر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ہم وطن بھائیوں کے بارے میں اپنا فرض پہچان لے تو صحت مندانہ سیاسی خیالات کی تبلیغ و ترویج نسبتاً بہت آسان ہو جائے گی جس سے ملک میں ایک حقیقی ذمہ دار حکومت کے قیام میں مدد ملے گی۔

میری رائے میں یہی وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے، پاکستان کی سالمیت اور ترقی کا انحصار اس کے باشندوں پر ہے بالخصوص نوجوان طبقہ پر۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ ان مراحل میں بھی کامیاب ہو کر دکھائیں جہاں ہم بوڑھے ناکام رہے ہیں۔ برصغیر ہند کی تقسیم بہت حد تک ہمارے نوجوان مردوں اور عورتوں کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ تھا جو بالآخر ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام پر منتج ہوئی اور جس کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک مدت تک جس چیز کو ناممکن العمل سمجھا جاتا تھا وہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک زندہ و پائندہ حقیقت بن کر ظہور پذیر ہوئی۔ یہ ہمارے اس فلسفی شاعر کے خواب کی تعبیر ہے جس نے وجد کے عالم میں ایک ایسی اسلامی ریاست کا تصور کیا جو اس برصغیر میں مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ہو

یہ ایک ایسے کمزور و ناتواں فرد کی اعلیٰ اور مثالی قیادت کی مستقل یادگار ہے، جس کا یقینِ محکم ان مشکلات اور دشواریوں کی چٹانیں پاش پاش کر دیتا تھا جو ہندو سرمایہ دار، برطانوی سامراج کی شہ اور بل بوتے پر اس کے راستے میں کھڑی کر دیتے تھے۔ یہ ہزاروں نفوس کی ان قربانیوں کی ایک مقدس یاد ہے جن کا پھل آج ہم کھا رہے ہیں۔ ہم اس مقدس امانت اور اعتماد کے امین ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم پاکستان کے فرض شناس اور باشعور شہری بن جائیں۔ ایک مثالی ریاست میں ہر شہری قوم کا جزو لاینفک ہوتا ہے جو اس کا بوجھ بانٹنے میں ملک و ملت کے مفاد کو مقدم رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت اپنی خواہشات و اغراض، آرام و آسائش، جان و مال اس پر نچھاور کرنے سے نہیں ہچکچاتا اور اس کی عزت و ناموس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

شہریت کی روح کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے؟ اور اس جذبہ کی تعمیر و تربیت کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں؟ ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ شہریت کا احساس جبلی نہیں ہوتا بلکہ پیہم تربیت سے حاصل ہوتا ہے انسان کی مجلسی زندگی میں اس بات کا امکان رہتا ہے کہ کہیں وہ سارے سماج کو صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال نہ کرے۔ یہ درست ہے کہ ہر انسان میں شہری بننے کی صلاحیت موجود ہے لیکن اس کے لئے صرف صلاحیت ہی

کافی نہیں، اس کی تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے۔ ہر انسان کو کسبِ معاش کے علاوہ اپنے دل و دماغ اور کردار کی تعمیر کے مواقع تلاش کرنے چاہئیں لیکن کسبِ معاش اور شخصیت کی تعمیر افراد کا شخصی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اس سے وہ معاشرے کا ایک مفید رکن تو بن جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ بہتر شہری بھی بن سکے جو معاشرے کی خدمت اور اس کے مفاد کا نگہبان ہو اور اپنی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کا احساس اور صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

عزیزانِ من! قوم کے تعلیمیافتہ افراد ہونے کی حیثیت سے آپ پر بھاری ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ آپ کو ملکی تعمیر میں نمایاں حصہ لینا ہے اور اپنے قومی نصب العین کے حصول کے لئے مخلصانہ جدوجہد کرنی ہے تاکہ آپ موجودہ نسل سے زیادہ موثر نتائج پیدا کر سکیں۔ یہ سب کچھ صرف اسی صورت میں ممکن الحصول ہو سکتا ہے جب آپ کے پیشِ نظر ہر وقت اسلامی اسوۂ حیات ہو۔ میں آپ کی توجہ احساسِ فرض، عزتِ نفس اور نظم و ضبط کی اہمیت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، کیونکہ ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے بجائے صرف اپنے حقوق اور مفاد پر زور دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ آج ہر شخص کی زبان پر یہی سوال جاری ہے کہ "پاکستان نے میرے لئے کیا کیا ہے؟" لیکن یہ سوال شاذونادر ہی پوچھا جاتا ہے کہ "میں

نے پاکستان کے لئے کیا کیا ہے؟" ہمارے دستور سازوں نے بھی "بنیادی حقوق" متعین کرنے کے لئے کمیٹیوں کی تشکیل تو کر دی ہے لیکن تعجب ہے کہ پاکستانی شہریت کے "بنیادی فرائض" وضع کرنے کا خیال کسی کو نہیں آتا اگر زندگی کے ہر مرحلے پر اور بالخصوص زمانۂ تعلیم کے ہر درجے میں فرائض کا احساس دلایا جائے تو ہماری بہت سی ایسی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی جو آئے دن زندگی کے مختلف شعبوں میں سر نکال لیتی ہیں۔

جہاں تک عزتِ نفس کا سوال ہے اس کے متعلق اس قسم کے اجتماع میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کیونکہ وقار و عظمت کے بغیر مسلمان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کلام پاک میں ارشاد ہے:۔ " اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان بلندیوں پر پہنچنے کے لئے مومن کو اپنے خیالات، اعمال اور کردار میں اپنی عظمت کا احساس ہونا چاہیئے۔ درحقیقت معزز وہی ہے جو اپنے سارے امور اللہ کو سونپ دے اور زندگی کے نازک ترین مرحلہ پر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے"

ایک اور اہم مسئلہ جو آپ کی توجہ کا مستحق ہے طلباء کی روز افزوں بدنظمی کا مسئلہ ہے۔ آج کل کارخانوں کی ہڑتالوں کی طرح طلباء کی ہڑتالیں بھی عام ہو گئی ہیں۔ صنعتی ہڑتالوں کے پس پشت اقتصادی وجوہات کارفرما

ہو سکتی ہیں لیکن طلباء کی ہڑتالوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا ذرا سی بات پر مظاہرے، واک آؤٹ اور ہڑتالیں کر دی جاتی ہیں اور ان کے محرکات میں "مشکل پرچہ" سے لیکر اسٹاف کے کسی رکن کی بوطرفی تک شامل ہیں۔ پھر ان مطالبات کی خاطر طلباء کے متحدہ محاذ قائم کیے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال یقیناً افسوسناک ہے اور اس کا فوری سدِباب ضروری ہے لیکن محض تعزیری اقدام اس کا حل نہیں ہے ہمیں علاج تجویز کرنے سے پہلے مرض کی تشخیص کر لینی چاہیئے اور اس سارے معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہیئے تاکہ اس قسم کے افسوسناک واقعات کا اعادہ نہ ہو۔ کیا ہم معمر لوگ اس معاملہ میں بری الذمہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یا ہم مجروح معصومیت کا روپ دھارنے میں حق بجانب ہیں۔ اگر طالب علم کے گھر، سکول اور کالج کا ماحول سازگار ہو اور اس کے سامنے والدین اور اساتذہ کا اسوہ ہو جس میں وہ اپنے فرائض دیانتداری کے ساتھ بجا لا رہے ہوں تو یقیناً اس کا خوشگوار اثر طالب علم کی طبیعت پر بھی ہو گا اور وہ ان کی تقلید کرنے کی کوشش کرے گا۔

باایں ہمہ اس بدنظمی اور انتشار سے طلباء کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی موجودہ صورتِ حال کو زیادہ دیر تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ نوجوانوں کے نظم و ضبط اور مناسب تربیت کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا اور کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان ناپاک

بیرونی اثرات کا ماتم کیا کرتا ہوں جو طلباء میں بدنظمی اور انتشار پھیلاتے ہیں جہاں تک کردار کا تعلق ہے اس کی تعمیر نصاب کی کتابوں کے ذریعہ نہیں ہُوا کرتی۔ بالخصوص اسلامی کردار پیدا کرنے کے لئے تو روزمرہ کی علمی تربیت لازمی ہے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کا کافی وقت لے چکا ہوں لیکن خاتمۂ کلام سے پہلے مجھے ایک اور اہم مسئلہ کی طرف رجوع کرنے کی اجازت دیجیئے۔ پنجاب میں تعلیم کا موجودہ معیار صوبے کے ہر بہی خواہ کے لئے تشویشناک ہے۔

پاکستان پبلک سروس کمیشن نے اپنی حالیہ رپورٹ میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ مرکزی حکومت کی اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں امیدواروں کی تعلیمی قابلیت ناقص، معلومات محدود ذہنی صلاحیتیں پست، صحت کمزور اور شخصیت بے رعب ہونے کے علاوہ قوتِ فکر اور جدتِ نظر بھی مفقود تھی۔ کمیشن کی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ امیدواروں کے جوابات ناپختہ علم پریشاں خیالی اور بے ربط اظہار کے آئینہ دار تھے اور ان میں طول نویسی، بے محل اور بے موقع اظہارِ رجحان غالب تھا۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ اس قسم کے عہدہ دار ایک آزاد ریاست کی

ذمہ داریوں کس طرح باحسن عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اس موقع پر یہ کہنا غالباً بے انصافی ہو گی کہ ہمارے نوجوانوں میں یونیورسٹی کے نصابِ تعلیم سے استفادہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ میری رائے میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کالجوں میں طلباء کی اس قدر کثرت ہے کہ وہ ہجوم کی صورت اختیار کر گئی ہے اور معلم اور متعلم کے درمیان نزدیکی رابطہ قائم نہیں رہا۔ دوسرے اساتذہ میں اگلے وقتوں کے فضلاء کی کمی ہو گئی ہے جن کی شہرت کشش کا باعث ہوا کرتی تھی۔ میرے لیے یہ صورتِ حال بھی چنداں حیران کن نہیں ہے، کیونکہ جس پیشہ میں معلم کے جسم و روح کو قائم و برقرار رکھنے کا معقول انتظام نہ ہو وہاں یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ بہترین لوگ خدمت کے لیے آگے بڑھیں اور قومی تعمیر کے اس پاکیزہ کام میں اپنا بہترین حصہ ادا کریں خصوصاً اس حالت میں جب کہ تعلیم کا دائرہ مسجدوں اور مقبروں کی حد سے نکل کر بے پایاں وسعتیں اختیار کر چکا ہے۔

دوسرے ممالک میں مالی اور دیگر مشکلات کے باوجود یہ اہتمام کیا جا رہا ہے کہ تعلیم میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے؟ اور کیا ہمیں اپنے دائرہ عمل میں اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ جب کبھی تخفیف کا کلہاڑا چلتا ہے تو اس کا پہلا وار تعلیم پر ہی ہوتا ہے؟

اگر ہم پاکستان کو ایک مستحکم ریاست بنانا چاہتے ہیں اور اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں، اپنی زندگیوں کو صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے متمنی ہیں تو ہمیں تعلیم کا مناسب و معقول انتظام کرنا پڑے گا۔ ایسی تعلیم جو کردار کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی اقدارِ زندگی کو رائج کرنے میں مدد دے اور عام تعلیم سے مختلف ہو جو بے ربط اور غیر منظم علوم کو دماغ میں ٹھونس دیتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں تعلیم کا معیار پست ہو، جمہوریت اور بالخصوص اسلامی جمہوریت نہیں پنپ سکتی۔ آج کل معیارِ زندگی بلند کرنے کا ہر طرف شور و غوغا ہے لیکن اسلامی تہذیب کے اعلیٰ معیار حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔

پاکستان پائندہ باد!

عظمتِ قرآن

دارالعلوم اسلامیہ پرانی انارکلی لاہور کے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے ۱۰ شعبان المعظم ۱۳۷۴ھ کو خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ آئندہ صفحات کی زینت ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں خلیفہ صاحب مرحوم نے قرآن حکیم کی عظمت، اس کے طریقِ تلاوت اس کی غیر فانی تاثیر اور اس کی لاثانی فصاحت پر نہایت بلیغ اشارے فرمائے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خلیفہ صاحب مرحوم نے اس حقیقت کو بھی ہمارے دلوں میں جاگزین کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ اگر ہم اپنی زبون حالی کو سربلندیوں سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قدرت کے اس بیش بہا خزانے (کتاب اللہ) کو اپنا رہنما بنائیں اور اس کے ارشاد کی روشنی میں زندگی گزاریں۔

عظمتِ قرآن

برسوں کی محکومانہ زندگی نے مسلمانانِ ہند کی روح کو کچل دیا تھا۔ عزم و ہمت وہ کھو بیٹھے تھے۔ ذہنی طور پر وہ پست سے پست تر ہو رہے تھے اور قریب تھا کہ ہمیشہ کے لئے ذلت و بربادی کے گڑھے میں گر جائیں کہ ایک مردِ قلندر نے ان کے سامنے ایک تخیل پیش کیا اور ایک مردِ مجاہد نے اس تخیل کو جامۂ عمل پہنایا۔ نتیجہ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا اور اب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فرنگی اور ہندو دونوں کے ملکی اور اقتصادی تسلط سے آزاد ہو کر اپنی زندگی اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام کی روشنی میں ڈھال سکتے ہیں۔ قدرت نے ہمیں ایک بیش بہا خزانہ عطا کیا ہے۔ مسلمانوں کے مصائب کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس خزانے سے جو ان کی اپنی غفلت کی

وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے، دوبارہ انہیں روشناس کرایا جائے تاکہ ان کی زبوں حالی سربلندی سے بدل جائے یہ متاعِ گراں بہا قرآن حکیم ہے۔
قرآن قصے کہانیوں کا مجموعہ نہیں نہ یہ ایسی کتاب ہے جو صرف چند دینی مسائل ہی پر مشتمل ہو۔ قرآن مجید ایک مکمل دستور العمل اور بہترین ضابطۂ حیات ہے۔ وہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں ان کے لئے خضرِ راہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس سے غفلت نہ برتیں۔ آج بھی انسانیت کا مستقبل اسی نسخۂ شفا کے علم و عمل سے وابستہ ہے، آج کے بچے کل کے رہبرانِ قوم ہوں گے، اس لئے اشد ضروری ہے کہ ہم اپنی اولاد کو اور کچھ دیں نہ دیں، قرآنِ عزیز کا علم ضرور دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود "خیرکم من تعلم القرآن و علمہ" فرما کر تعلیمات قرآنی کی اہمیت واضح کر دی۔ کتاب اللہ کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بھی خواہش ہے کہ اس کے بندے اس کو بہت زیادہ پڑھیں اور اسے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ غالباً یہی خیال ہمارے مفکرِ اعظم علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر تھا جب انہوں نے فرمایا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

میرا یہ مطلب نہیں کہ الفاظ قرآنی کو رٹ کر طوطے کی طرح فرفر دہرا دیا جائے

قرآن پڑھنے کا طریقہ تو خود اس کتاب پاک میں درج ہے: "رتل القرآن ترتیلا" قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو کہ ایک ایک لفظ سمجھ میں آجائے حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس طرح پڑھنے سے فہم و تفہیم اور تدبر فی القرآن میں مدد ملتی ہے، دل پر اثر زیادہ ہوتا ہے اور قرآن کے سمجھنے کا شوق بڑھتا ہے۔

اہلِ عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا۔ ہر سال عکاظ کے میلے میں خطابت و قصیدہ خوانی کا مقابلہ ہوتا اور جس قصیدے کو بہترین سمجھا جاتا اسے خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لئے عربستان کے لوگ دور دراز گوشوں سے آ آکر مکہ معظمہ میں جمع ہوتے اور اس مقابلے میں حصہ لیتے۔ نزولِ قرآن کے بعد کسی نے سورۂ کوثر خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دی تو وقت کے افصح العرب نے اس کے نیچے لکھ دیا "ماھذا قول البشر" قرآن شریف کی بھی معجزانہ فصاحت تھی جس نے ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہنے والوں کو خود گنگ کر دیا میرے نزدیک تو یہ بھی ایک معجزۂ قرآن ہے کہ دنیا بھر کی کتابوں میں نثر کی یہی ایک کتاب ہے جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور جو ترنم کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے اسی لئے تو ترتیل فی القراۃ کا حکم آیا عیسائیوں اور ہندوؤں کے ہاں خوش گلو ہونا کمالِ ترتیل ہے اور "گلنے" کے

آداب بھی عبادت میں شامل ہیں مگر اسلام نے فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں اپنا ایک مستقل نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق فنون لطیفہ میں دو باتیں شامل ہیں۔ ایک تو فن کا وہ پہلو جسے افادی پہلو بھی کہا جا سکتا ہے یعنی کوئی چیز کیوں اور کیسے کی جائے۔ دوسرے اس کی لطافت اور حسن کا پہلو یعنی وہ چیز اس طرح کی جائے کہ اس سے ذوقِ جمال کی تسکین ہو۔ اس اصول کے مطابق ترتیل کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ افادیت اور معنویت سے الگ رہ کر محض زبان اور حلق کے ذریعے الفاظ قرآنی سے تلعب روا رکھا جائے۔ اسی طرح تجوید کے معنی تحسین کے ہیں۔ "زینوا اصواتکم بالقرآن" کا مطلب بھی یہی ہے یعنی ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھا جائے اور آواز ایسی ہو کہ قرآن عزیز کے لفظی اور معنوی محاسن اجاگر ہو جائیں۔

ناظم صاحب کی رپورٹ میں نے بڑے غور اور توجہ سے سنی۔ یہ معلوم کر کے مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ یہ دارالعلوم قرأت و تجوید کا ایک مرکزی ادارہ ہے اور اس میں تدریس قرآن کا ایسا اچھا انتظام ہے کہ اس کے طفیل شہر لاہور کو اس باب میں مرکزیت حاصل ہو گئی ہے۔ جناب قاری عبدالمالک صاحب کی رہنمائی میں یہ درس گاہ قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ تین سال کے قلیل عرصے میں اس نے جو شاندار کام کیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ مالی دقتوں کے باوجود اس کی کارگزاری جناب قاری صاحب اور ان کے رفقائے کار

کے اخلاص و ایثار کی نمایاں دلیل ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دارالعلوم نہ صرف جاری رہے گا بلکہ اس کے فیض یافتگان میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔

جلسۂ تقسیم اسناد ہر مہذب اور متمدن قوم کی تعلیمی زندگی کا امتیازی نشان بن چکا ہے۔ ہم مسلمانوں کے ہاں یہ تقریب ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے موجود ہے تاریخِ اسلام میں پہلا جلسۂ تقسیم اسناد بغداد کی شہرہ آفاق دانش گاہ نظامیہ میں جس کی بنیاد نظام الملک نے رکھی تھی منعقد ہوا۔ اس دانش گاہ کا سالانہ اجلاس تقسیمِ اسناد جو' یوم فضیلت' کے نام سے مشہور ہوا علم و عرفان کا سرچشمہ قرار پایا اور اس سے علوم و معارف کی نشر و اشاعت کے سوتے پھوٹے۔ اسی طرح دارالعلوم اسلامیہ' پرانی انارکلی لاہور کا یہ جلسۂ تقسیم اسناد ایک نہایت خوشگوار مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ تقریب اس ادارے کی زندگی میں ایک سنگِ میل بننے کے علاوہ ان شاء اللہ ہماری قومی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گی اور فارغ التحصیل طلبہ کے دلوں میں ایک ایسا حیات آفریں جذبہ پیدا ہوگا جس کے ذریعے علوم و معارف اسلامیہ کے چشمے گرد و نواح کے تمام علاقوں میں بہنے لگیں گے۔ خدا کرے کہ میرا یہ خواب پورا ہو! آمین!

مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ اس مفید ادارے کے مصارف مداخل سے زیادہ ہیں، یہ امر بانیان و منتظمان مدرسہ کو ضرور پریشان کرتا ہوگا لیکن باعثِ تشویش ہرگز نہیں ہونا چاہیئے، انجمن حمایت اسلام ایسے عظیم الشان ادارے سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر مجھے اس راہ کی مشکلات کا پورا احساس ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مالی خسارے میرے لیے خوف و ہراس کا موجب نہیں ہوتے بلکہ میری رائے میں کارکنوں کے عزم و استقلال اور ہمت و بلند حوصلگی میں اضافہ کرتے ہیں مجھے امید ہے کہ اہلِ خیر اور اربابِ ثروت اس ادارے کی طرف دستِ تعاون بڑھا کر اس کے کارکنوں کی ہمت افزائی کریں گے اور ان کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں سہولتیں بہم پہنچائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عُلومِ مَشرقی کی تعلیم

علومِ مشرقی کی قدیم ترین درس گاہ اورنٹیل کالج لاہور کے سالانہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے ۲۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ آئندہ صفحات کی زینت ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم کے اس فاضلانہ اور پُرمغز خطبۂ صدارت میں بظاہر اورنٹیل کالج کی ان مشکلات کی نشاندہی کی گئی ہے جو علوم مشرقی کے احیاء کے سلسلے میں اس وقت پیش آ رہی تھیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مرحوم نے اس خطبۂ صدارت میں ان تمام درس گاہوں کی مشکلات کی جانب اشارے فرمائے ہیں جو عربی و فارسی اور علومِ دینیہ کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ مشرقی اور خصوصاً مقامی زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کی افادیت و ضرورت آج بھی مسلّم ہے۔ اس خطبے کے آخر میں انہوں نے طلباء کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس خطبے پر آٹھ سال گزر جانے کے باوجود بھی حالات جوں کے توں بلکہ اور زیادہ خراب ہو چکے ہیں اور طلباء خلیفہ صاحب مرحوم کے ان مشوروں کے اور زیادہ محتاج ہیں۔

علومِ مشرقی کی تعلیم

اورینٹل کالج تعلیم وتحقیق کی عظیم الشان روایت کی بنا پر ایک منفرد اور امتیازی حیثیت کا مالک رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نمایاں حیثیت کو برقرار رکھنا بلکہ اسے ترقی دینا ہمارا قومی اور ملی فریضہ ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اورینٹل کالج ۱۸۷۰ء میں قائم ہوا اور جب ۱۸۸۲ء کے قانون انضمام کے مطابق اس ادارے کو یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا تو ۱۸۸۸ء کی تشکیلِ نو کے بعد اس کالج کا نصب العین مندرجہ ذیل الفاظ میں متعین کیا گیا۔

"سنسکرت، عربی اور فارسی میں، ان طلبہ کے لئے جو یونیورسٹی کے امتحاناتِ عالم و فاضل کی تیاری کرنا چاہیں صحیح بنیاد اور تاریخی طریقوں کے مطابق

"السنہ و ادبیات کی تعلیم کا اہتمام"

قطع نظر اس امر کے کہ دورِ غلامی میں عربی اور فارسی کی افادیت کیا تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالاتِ حاضرہ میں ہماری کلاسیکی زبانوں اور بالخصوص عربی نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ قیام پاکستان کے باعث ہماری قومی زندگی میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی دنیا میں جو اہمیت ہمارے ملک کو حاصل ہو رہی ہے اور بالخصوص اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارے روابط جس سرعت کے ساتھ مضبوط و مستحکم ہو رہے ہیں یہ سب امور مقتضی ہیں کہ عربی کی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔ خوش قسمتی سے اس بات میں کسی خاص کاوش کی ضرورت نہیں۔ السنہ شرقیہ اور خاص کر عربی و فارسی کی اہمیت کے سلسلہ میں ہم مسلمانوں کے تصورات بالکل واضح ہیں۔ کم از کم میرے ذہن میں اس معاملہ کے متعلق کسی طرح کا تذبذب نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی علوم جن کی علمی اور تہذیبی اہمیت ہمیشہ سے مسلم رہی ہے، حصول آزادی کے بعد ہمارے لئے اور زیادہ اہم بن گئے ہیں۔ غلامی کی زنجیروں نے جن علمی اور تہذیبی روابط کو پوری طرح پنپنے اور ترقی پانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ انہیں بدلے ہوئے حالات میں پوری طرح پروان چڑھانا ہم پر لازم ہو گیا ہے۔ اس تہذیبی، اخلاقی اور قومی فریضہ کو سیاسی مصالح نے اہم تر اور قومی ترجمہ بنا دیا ہے

اس لئے ایسے تعلیمی اداروں میں جن کی تشکیل ہی اس مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے کہ وہ مشرقی علوم کی ترقی و ترویج کی خدمات انجام دیں، نمایاں طور پر ایسی فضا پیدا ہونا چاہیئے جس میں ہر نو وارد و نادانستہ طور پر محسوس کرے کہ ان علوم کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ کالج میں بعض مغربی زبانوں کی تدریس کا انتظام کیا گیا ہے۔ فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانوں کی علمی اور ثقافتی حیثیت کو میں تسلیم کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اورینٹل کالج میں ان زبانوں کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ اس کالج کی علمی روایات کے عین مطابق ہے۔ لیکن یہ خلش دل میں ضرور پیدا ہوتی ہے کہ مغربی زبانوں کے ساتھ اربابِ اقتدار کا انہماک خدانخواستہ اس بات پر منتج نہ ہو کہ وہ مشرقی علوم کی اہمیت سے غافل ہو جائیں یا ان کی اس حیثیت کو نظر انداز کر دیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ پرنسپل صاحب کی رپورٹ کے بعض حصوں سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اس سال کالج نامساعد حالات سے دوچار رہا ہے اور کارکنوں کے دلوں میں کچھ بے اطمینانی اور انتشار کی کیفیت موجود رہی ہے بلکہ کہیں کہیں تو احساسِ محرومی و مایوسی بھی نمایاں تھا۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ حکومت نے جو نیا یونیورسٹی ایکٹ وضع کیا ہے اس میں علوم مشرقیہ کے لئے مناسب تحفظات کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ چنانچہ کالج میں مشرقی علوم کی وہ جماعتیں جنہیں کالج کے

نصاب تعلیم میں ایک واضح اور مستقل مقام حاصل تھا بند کردی گئیں اور امتحانات کے معاملہ میں ان جماعتوں کا الحاق یونیورسٹی کے بجائے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے ساتھ کردیا گیا ہے۔ میں اس احساسِ زیاں کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہی احساس اس کالج کی آئندہ ترقی و بہبود کا ضامن ہوگا

پرنسپل صاحب نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اس کالج کا برقرار رہنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے لیکن غالباً ان کا بھی یہ مطلب نہیں کہ یہ کالج پرانی نہج پر ہی چلتا رہے۔ مدت سے یہ تقاضا ہو رہا ہے کہ اس کالج کے نظام میں مناسب اصلاحات کی جائیں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پرنسپل صاحب نے بھی اپنی رپورٹ میں اصلاح کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہمارے اداروں میں وقتی تقاضوں کے مطابق اصلاح ہوتی رہنی چاہیئے۔ اس کالج کی تعلیم و تدریس میں اصلاحات تجویز کرنے کے لیئے وقتاً فوقتاً کمیٹیاں مقرر کی جاتی رہی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے پیش نظر حکومت نے ماہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں ایک کمیشن کا تقرر کیا تھا۔ اس کمیشن نے یونیورسٹی اور اس کے تدریسی نظام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد جو سفارشات پیش کی تھیں ان میں سے یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے متعلق ایک علمی اکادمی کا تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے کمیشن کی خواہش ہے

کہ اورینٹل کالج میں تعلیم السنہ شرقیہ و غربیہ کے سلسلے میں بلند تر نوعیت کی تدریس و تحقیق کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ وہ اپنی رپورٹ میں واضح کرتے ہیں کہ علوم شرقیہ کا مفہوم ان تمام علمی اضافوں پر حاوی ہے جو مشرق نے انسانی معلومات کے عظیم الشان ذخیرے، یعنی ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، لسانیات، طب، قانون، فنونِ لطیفہ، اور سائنس کے تمام شعبوں میں مہیا کئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کمیشن کی یہ تصریحات مشرقی علوم کی تعلیم و تحقیق سے دلچسپی لینے والوں کے لئے بڑی حوصلہ افزا تھیں اور پنجاب یونیورسٹی کے سینیٹ نے بھی ان کی تائید کی تھی لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ نئے ایکٹ میں ان کو نظر انداز کر دیا گیا بلکہ پنجاب یونیورسٹی ایکٹ کی تنسیخ جو شاید اصطلاحی وجوہات کی بنا پر ضروری سمجھی گئی ظاہر کرتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کا جو مقصد اس وقت پیش نظر تھا اب پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ یہ امر کسی حد تک باعثِ تسکین ہے کہ ابھی آئین و فرائین کا وضع ہونا باقی ہے اور ان تمام امور کا انصرام ہو سکتا ہے جو قانون سازی کے وقت بوجہ عجلت ترک یا نظر انداز ہو گئے تھے۔ اربابِ اقتدار سے توقع ہے کہ وہ آئین و فرائین وضع کرتے وقت اس تصور کو جو یونیورسٹی کمیشن نے پیش کیا تھا عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے۔

چانسلر صاحب کی مقرر کردہ کمیٹی آج کل اس معاملہ پر غور کر رہی ہے

مجھے بھی اس کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز حاصل ہے۔ اس ہفتے اس کمیٹی کا ایک اجلاس بروز پنجشنبہ ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ چونکہ اسی وقت اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا میں کمیٹی میں حاضر نہ ہو سکا لیکن مجھے یہ دیکھ کر انتہائی رنج و افسوس ہوا کہ فیکلٹیوں کے متعلق جو تجاویز اس کمیٹی کے ایجنڈے میں شامل رکھی گئیں ہیں ان میں نہ صرف فردانیت اور مناسبت کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا بلکہ عربی اور فارسی کی اہمیت کو بھی بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قیام پاکستان کے بعد ان زبانوں کی تعلیم قریباً مقصد بالذات کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کیونکہ ہمارا تمام مذہبی اور ثقافتی لٹریچر انہی زبانوں میں محفوظ ہے۔ علاوہ بریں اسلامی ممالک کی بین الاقوامی زبان عربی ہی ہو سکتی ہے اور اس اعتبار سے یہ عالمگیر اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہی زبان تمام عالم اسلام کو رشتۂ وحدت میں منسلک کرتی ہے۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی عربی کی عظمت اور علوم عربیہ و اسلامیہ کی اشاعت کی ضرورت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ کہ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے، صرف اسی صورت میں قابلِ اعتنا ہوگا جب ہم اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی مخصوص روایاتِ ملی کی حفاظت کر سکیں اور یہ ممکن نہیں جب تک ہم اپنے تمام علمی دفاتر پر جو عربی زبان میں ہیں حاوی نہ ہو جائیں اس پر مستزاد یہ کہ ہماری نوزائیدہ مملکت دوسرے ممالک سے بالعموم

اور اسلامی ممالک سے بالخصوص اپنے ثقافتی، سماجی اور تجارتی تعلقات قائم کر رہی ہے۔ ان تعلقات کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ہم اپنے نوجوانوں کی تربیت صحیح خطوط پر کریں تاکہ وہ اپنی سفارتی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہو سکیں۔

ایک انمل بے جوڑ قسم کی فیکلٹی تجویز کی گئی ہے جو ایسے مختلف مضامین پر مشتمل ہے جن کا آپس میں بظاہر کوئی بالواسطہ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ علوم اسلامیہ اور موسیقی کو چند دیگر مضامین کے ساتھ ملا کر ایک فیکلٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ فنون لطیفہ میں تو موسیقی شمار کی جا سکتی ہے لیکن اس کا رابطہ ایک طرف اسلامیات کے ساتھ اور دوسری طرف بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ برعکس اس کے اسلامیات اور عربی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ درحقیقت اسلامیات کے مختلف علوم مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ میں اعلیٰ قابلیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ عربی زبان پر کامل عبور حاصل نہ ہو۔ لہٰذا ان دونوں مضامین کو علیحدہ علیحدہ فیکلٹیوں میں ٹھونس دینے کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا۔ اسلامیات کو اعلیٰ معیار پر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی فارسی اور اسلامیات کی ایک ہی مشترکہ فیکلٹی ہو۔

انتہائی ستم ظریفی ہو گی اگر اصلاح کے نام پر کوئی ایسا منصوبہ تیار

کیا جائے جس سے اورینٹل کالج ہی جو پنجاب یونیورسٹی کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے تباہ ہو جائے۔ کالج کی تشکیل نو کا جو تصور یونیورسٹی کمیشن نے پیش کیا ہے اسے عملی جامہ پہنانے کا بہترین طریقہ ہے کہ عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا نصاب اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ وہ محض ادبیات تک ہی محدود نہ رہے بلکہ تاریخ فلسفہ اور دیگر علوم جدیدہ کا بھی احاطہ کر سکے۔ ضرورت تو اس چیز کی ہے کہ معیارِ نصاب کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اگر عالم اور فاضل کی جماعتوں کو بند کرنا بھی مقصود ہو تو علوم شرقیہ و اسلامیہ کی تعلیم و تدریس اعلیٰ پیمانہ پر جاری رہے۔ اورینٹل کالج کے طلبہ بی۔ او۔ ایل اور ایم۔ او۔ ایل کی ڈگریاں بلاواسطہ حاصل کر سکیں۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی زبان کا شعبہ بھی جلد از جلد قائم ہونا چاہیئے۔ اور اردو، جو ہماری قومی زبان ہے لیکن عربی اور فارسی کی طرح کس مپرسی اور بے اعتنائی کا شکار ہو رہی ہے اس کی طرف بھی ہمیں پہلے سے زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے تاکہ ہم ان علوم کو جلد از جلد اپنی زبان میں منتقل کر سکیں جن کے بغیر تعلیم اور حکومت، دونوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی تعلیم کا انتظام بھی ضروری ہے اور اس سلسلہ کی آخری کڑی یہ ہے کہ ہندی اور سنسکرت کے ان شعبوں کو جو تقسیم ملک سے پہلے اس کالج میں موجود تھے اور جنہوں نے ریسرچ کے میدانوں میں

گراں قدر خدمات انجام دی تھیں از سر نو قائم کیا جائے۔

میں نے یہ تجاویز ارباب اقتدار کے غور و فکر کے لئے پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کی سب یونیورسٹی کمیشن کے وضع کئے ہوئے نصب العین کے مطابق ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جسے ناقابلِ عمل کہہ کر رد کیا جا سکے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر ہم اورینٹل کالج کی تشکیلِ نو ان خطوط پر نہیں کرتے تو گویا اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں... جو قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے حالات اور مطالبات نے ہم پر عائد کیا ہے۔ ہم سب اورینٹل کالج کی اصلاح کے خواہشمند ہیں لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اصلاح، تخریب کی نہیں، تعمیر کی ہمنوا ہے۔ تنزل کی نہیں ترقی کی ہم عناں ہے۔ ہمیں اپنی تہذیبی زندگی کو ماضی کی روایتوں کے ساتھ وابستہ کرنے اور مشرقی علوم سے بڑے بڑے قومی اور بین الاقوامی کام لینے کے لئے ایک باوقار ادارہ کی ضرورت ہے وہ ادارہ ہمارے پاس بنا بنایا موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی غفلت سے یا سہو چینے کے غلط انداز سے اس ادارہ کو تباہ نہیں ہونے دیں گے بلکہ اس کو ملک بھر میں مشرقی علوم کی تعلیم، تدریس اور تحقیق کا سب سے بڑا مرکز بنائیں گے۔ خدا کرے کہ میری یہ توقعات پوری ہوں۔

میں آپ کا کافی وقت لے چکا ہوں لیکن خاتمۂ کلام سے پہلے مجھے

اجازت دیجیے کہ میں طلبہ اور طالبات سے چند باتیں کر لوں۔

سب سے پہلے تو میں آپ میں سے ان سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جنھوں نے اس سال کا مجوزہ نصاب کامیابی کے ساتھ ختم کیا اور وہ انعامات حاصل کئے جو اس کے امتیاز کی علامت ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ میں کہنے والا ہوں مجھے احساس ہے کہ اس کی حیثیت ایک ایسے اجتماع کے سامنے جو اسلامی روایات سے ہی رہنمائی حاصل کرتا ہو محض اعادہ کی ہے۔ لیکن بعض باتوں کی اہمیت میں تکرار سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ روزمرہ کی دنیا میں خوشحال زندگی بسر کرنے کے لیے چند بنیادی اصولوں کا تعین ازبس لازمی ہے۔ وقت کی سب سے اہم ضرورت اخلاقی بیداری ہے تاکہ ہمیں انفرادی طور پر ان اعلیٰ اقدار کا احساس ہو سکے جن کی بنا پر ہمارے وطنِ عزیز کی تخلیق ہوئی ہے۔ جس بے راہ روی کا آج کل مظاہرہ ہو رہا ہے ہمارے قومی اور ملکی مزاج میں جتنی خرابیاں موجود ہیں اور قومی وقار جس بے دردی سے پامال کیا جا رہا ہے ان سب کی وجہ ہماری انفرادی برائیاں ہیں۔ کیونکہ جب تک افراد کے کردار کی تعمیر نہیں ہوتی ملکی اور قومی برائیوں کا قلع قمع بھی نہیں ہو سکتا۔

ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں پاکستان کے آزاد شہری ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن کیا ہم آزادی کے مفہوم سے واقف ہیں؟ کیا ہم ان ذمہ داریوں

سے بھی آگاہ ہیں جو آزادی سے وابستہ ہیں ؟ کیا ہم صدق دل سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے طور طریقے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے باشندوں کے شایانِ شان ہیں ؟ کیا ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم اپنے طرزِ زندگی سے دوسروں پر کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں ؟ کیا کبھی ہم نے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خدمتِ خلق کی کوشش کی ؟ کیا ہمیں کبھی اپنے حقیر ذاتی مفاد کو ملک و قوم کے وسیع مفاد کے تابع بنانے کا خیال آیا۔ کیا ہم نے امانت، حسن سلوک، معاملات اور فرائض کے بارے میں ان بلند اصولوں کو پیش نظر رکھا جو اسلام نے ہمیں سکھائے ہیں ؟

اسلام زندگی کی الجھنوں سے کنارہ کشی نہیں سکھاتا۔ اسلام تو زندگی میں ترقی کرنے کا دوسرا نام ہے۔ لا رھبانیۃ فی الاسلام کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان کی نیکی کا راز زندگی کی دائمی کشمکش میں پنہاں ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات میں پوری دلچسپی لے۔ زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ زندگی کے ٹھوس حقائق میں گرمجوشی سے حصہ لے، کٹھن سے کٹھن منزل میں بھی ہمت کو پست اور عزم کو سست نہ ہونے دے۔ اس کے دل میں فکر و عمل، اجتہاد اور جد و جہد کا جذبہ موجزن ہو اور وہ اپنی زندگی کو ایسے سانچوں میں ڈھالے جو کردار و سیرت اور اخلاق و شمائل سے اسلامی تعلیمات کی

آئینہ داری کرے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قومی عزت و وقار برقرار رکھنے اور ملک و ملت کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ آمین ۰

یونیورسٹی اور اُس کی اہمیّت

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے پنجاب یونیورسٹی کے کنووکیشن کے موقع پر ایک فاضلانہ خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا جس میں آپ نے طلبہ اساتذہ اور ان تمام دانشوروں کو نہایت مفید اور پر حکمت مشورے دیئے تھے جو اس علمی اجتماع میں شریک ہوئے تھے۔ یہ خطبۂ صدارت آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ آپ کے اس خطبے کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ "صرف قواعد و ضوابط کی باقاعدہ مشینری، تعلیم کا منظور شدہ نصاب یا تجربات کا ساز و سامان تعلیم کی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کی کامیابی کا دار و مدار ان مہذب اور باخبر اہل علم پر ہے جو اپنی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان طلبہ اور طالبات کے ذہن کو متاثر کر سکیں۔" یونیورسٹی کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "یونیورسٹی ایسے اشخاص کی برادری پر مشتمل ہونی چاہیئے جن کے لئے فکری اور اخلاقی اقدار کا حصول ایک پیشے کی حیثیت نہ رکھے بلکہ ان کی زندگی کا مشن بن جائے۔"

یونیورسٹی اور اس کی اہمیت

یونیورسٹی محض بے جان اینٹوں اور چونے کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک زندہ ادارہ ہے۔ یہ ان پرشکوہ عمارات پر ہی مشتمل نہیں ہوتی جنہیں لیکچر حال، لیبارٹریوں یا لائبریریوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہو بلکہ یہ افراد کی ایک مدنی جماعت ہے (CORPORATE BODY) جس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ ماضی کے تجربہ اور علم کو محفوظ رکھا جائے اور اس پر تبصرہ کیا جائے بلکہ اس علم میں اضافہ بھی کیا جائے۔ کوئی یونیورسٹی اس وقت تک اس نام کی مستحق نہیں جب تک کہ وہ اپنے تمام شعبوں اور سرگرمیوں میں یہ دوگونہ فرض ادا نہ کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء ان مقاصد کو پیش نظر رکھیں اور ان کے حصول کے لئے مشترکہ کوششیں بروئے کار لائیں۔

کئی برس پیشتر جب کہ میں خود اس یونیورسٹی کا طالب علم تھا میں نے اپنی تعلیم کو اس زمانے کے اوسط درجے کے طالب علم کی طرح حاصل کیا اور امتحانات میں شریک ہوتا رہا۔ ان گزرے ہوئے دنوں میں میں تعلیم اور امتحانات کو زندگی کے وسیع ڈرامے کا حصہ تصور نہیں کرتا تھا اور نہ ہی میں نے تعلیم اور امتحانات کو علمی جد و جہد کے عملی پس منظر میں دیکھا کیونکہ صرف یہی شے ہے جس سے زندگی کی رہنمائی ہو سکتی ہے یا اس کا کوئی مفہوم متعین ہوتا ہے۔ شاید اپنی ذات کو مرکز قرار دے کر مطالعہ کی عادت اپنا جواز اور افادیت رکھتی ہے کیونکہ توجہ عملی طور پر ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس کی چمک محدود ہونے کے باعث اس نسبت سے تیز ہے مگر جس کے پیچھے یا جس کے ورے جھانکنا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ اس سال کے سند یافتہ طلبا ہونے کے باعث اس منصوبہ کے مفہوم اور مقصد پہ غور و فکر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس امر کو سمجھنے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں کہ یونیورسٹی میں آپ کی تمام تر مساعی محض ایسی چھوٹی ندیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کا زندگی کے وسیع سمندر میں اپنا الگ حصہ ہے۔ اگر تعلیم کے باعث آپ میں ایسی صلاحیتیں نہیں ابھریں جن کے ذریعہ آپ ملک کے داخلی دباؤ اور بین الاقوامی دباؤ کا مقابلہ کر سکیں تو آپ کی تعلیم بے کار ہے۔ زندگی کے راستہ میں بہت جلد ایسا موڑ اور ایسی صورت حال پیدا ہونے والی ہے جو اس امر کو جانچنے کی کسوٹی ہو گی کہ جو تعلیم آپ نے یونیورسٹی میں حاصل کی ہے

وہ ایک جنس بے مایہ ہے یا ذہن کا ایک ایسا زندہ تجربہ بن چکا ہے جس کی جڑیں ایسے درخت کی طرح زمین میں پیوست ہیں جو برابر پھلتا اور پھولتا رہتا ہے مگر میں آج آپ سے مستند درس گاہوں سے تحصیل علم کی افادیت کی جانچ پڑتال پر خطاب نہیں کرنا چاہتا۔ مجھ سے قبل اس موضوع پر کہنے والے بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور شاید آج بھی اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ درس گاہوں سے تحصیلِ علم کی کچھ نہ کچھ افادیت ہے بشرطیکہ اس اصطلاح کا کوئی مفہوم ہو۔ اس وقت مجھے جس بات کا خیال ہے وہ اعلیٰ افکار کی تخلیق کا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک یونیورسٹی ایک ایسا مقام ہے جہاں ارفع و اعلیٰ تصورات کی تخلیق ہوتی ہے۔ ابتدا ہی سے میری یہ رائے رہی ہے کہ یونیورسٹی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہی نہیں کہ انسان کو مجلسی میل جول کا سلیقہ حاصل ہو جائے۔ انسانی روح کی نمود کا بہترین مظاہرہ یہی نہیں کہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے بلکہ یہ کہ زندگی کے لیے بلند تر مثال اور نمونہ قائم کیا جائے۔ ایک یونیورسٹی تخلیقی قوت کو بروئے کار لا سکتی ہے اور ذہن کی ساری قوتوں کی متناسب ترقی کے اسباب مہیا کر سکتی ہے۔ تن تنہا مقولوں سے بھرپور حافظہ یا خیالات سے اٹا ہوا ذہن فی نفسہٖ اس کارنامے کو سر انجام نہیں دے سکتا، لیکن لطیف احساس، تربیت یافتہ تخیل اور منضبط قوت ارادی کے باعث انسانی حافظہ اور ذہن روحانی قوت کے پوشیدہ

خزانوں کو بدرجۂ کمال حاصل کر سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک یونیورسٹی ان تخلیقی احساسات کا سرچشمہ کیسے بن سکتی ہے۔ "یونیورسٹاس" کا لغوی مفہوم "ہم سب" ہے اور یہ مشترکہ مساعی کی عالمگیر قوت اور روحانی کامیابی کی علامت ہے۔ یونیورسٹی ایسے اشخاص کی برادری پر مشتمل ہونی چاہیے جن کے لیے فکری اور اخلاقی اقدار کا حصول ایک پیشہ کی حیثیت نہ رکھے بلکہ ان کی زندگی کا مشن ہو۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کو ایک ایسی ہی برادری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد پانچویں صدی ہجری میں نظام الملک نے رکھی تھی۔ اس درسگاہ نے اسلام کے شاندار ازمنہ کی علمی زندگی کے لیے ایک مثال کا کام کیا اور بالآخر یورپ کے دورِ احیاء کی درسگاہوں میں بھی اسی درسگاہ کی جھلک دکھائی دی۔ نیومین (NEW MAN) کا خیال ہے کہ "تعلیم یافتہ شخص اپنا الگ مذہب رکھتا ہے۔ اس کا مذہب ایک حد تک قدرت کا مؤید ہے اور کسی حد تک اس کے خلاف ہے۔" اسلام کی جملہ معاشرتوں میں علم اور مذہب کا اشتراک (جو بغداد میں زوال پذیر ہو گیا تھا) اپنے آغاز میں اسی وجہ سے امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ اس کو دوہری تائید حاصل ہونے کی امتیازی شان بھی حاصل تھی۔ تعلیم کے باعث نہ صرف اس مذہبی رجحان نے فروغ حاصل کیا جس کا ذکر "نیومین" کی تعریف میں ہے۔ بلکہ اپنے آغاز میں اس کو

مذہبی نقطہ نظر ہی نے پیدا کیا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو علم ہے اسلام نے ہر مسلمان مرد اور عورت پر طلب علم فرض قرار دیا ہے۔ تعلیم کے بارے میں اس نقطہ نظر کو ہمارے ہاں زندہ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا ذہن و تخیل اور احساس کو ایک نقطہ پر مرکوز و مخلوط کرنا چاہیئے جو صحیح علم کی طلب کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس سلسلہ میں انسانی صلاحیتوں کے اختلاف کے باعث ایک دور نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ درس گاہی تعلیم کے اعلیٰ ترین نتائج صرف ایک اعلیٰ تربیت یافتہ اقلیت ہی حاصل کر سکتی ہے۔ بہرحال ایک اوسط درجہ کی دماغی صلاحیتوں کے انسان کو علمی زندگی کے پیچ دار پہلوؤں سے الگ بھی نہیں رکھنا چاہیئے نہ ہی ایک فاضل کو اپنے ہم جنسوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہم پرانی انگریزی یونیورسٹیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جہاں ایسا انتظام ہے کہ عوام کو نئی معلومات بہم پہنچانے کے لئے مناسب بندوبست کیا جاتا ہے یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ اداروں نے عام اشخاص کے عطیات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ جب کہ وہ اپنی جگہ قوم کے لئے ایک کامل نفوذ پذیر قوت میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اس نفوذ کو مخصوص اور سوچے سمجھے ہوئے طریقوں سے کام میں لایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کیمبرج میں "کھلے" لیکچروں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جہاں سائنس اور ادب کے نصاب کے بعض اجزاء میں عوام کو شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ ذاتی حیثیت سے میں کہوں گا کہ

ہمارے لئے وہ دن بڑا مبارک ہوگا جب ہمارے کتب خانوں، لیبارٹریوں عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں کے اسرار د خواہ ان کی تعداد کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو) مخصوص ماہرین کے علاوہ عوام پر بھی کھول دیئے جائیں گے۔

اپنے گھریلو معاملات کی طرف رجوع کرتے ہوئے مجھے حال ہی میں مجلس قانون ساز میں پنجاب یونیورسٹی بل پر بحث سننے کا موقع ملا ہے۔ ایوان میں جو منصب مجھے حاصل ہے اور اس کی وجہ سے جو پابندیاں عائد ہیں ان کے باعث میں اہم زیر بحث مسائل پر اپنے خیال ظاہر نہیں کر سکتا۔ مباحثہ کے دوران میں میں نے تمام تقاریر کو بڑی توجہ سے سنا۔ بعض اوقات مجھے خوشی ہوئی اور بعض اوقات مایوسی۔ کئی مواقع پر میں نے چاہا کہ ہمارے ہاں بھی ایسی کنونشن ہوتی جیسی کہ امریکی مجالس قانون ساز کے سپیکروں کے لئے موجود ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی منصبی کرسی کو چھوڑ کر بحث میں حصہ لے سکتے ہیں اور عام ارکان کی طرح اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ بہر کیف اس بل کو پنجاب اسمبلی نے منظور کر لیا ہے اور اب وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ یونیورسٹی پر اس کے کیا اثرات ہوں گے اور اگر غور کیا جائے تو قانون کی عبارتیں کسی تنظیم کو سنوارنے یا بگاڑنے میں ممد نہیں ہوتیں۔ اس کا انحصار تو خود اشخاص پر ہے اس لئے نئے منظور شدہ بل کی افادیت یا عدم افادیت کا دارومدار بھی انہی افراد کے طرز عمل پر ہوگا جن کے ہاتھ میں تعلیمی سرگرمیوں کی باگ ڈور ہے۔

نظامِ تعلیم کا محور استاد کی شخصیت ہے کیونکہ صرف قواعد و ضوابط کی کوئی باقاعدہ مشینری، تعلیم کا منظور شدہ نصاب یا تجربات کا ساز و سامان تعلیم کی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کی کامیابی کا دار و مدار ان مہذب اور باخبر اہلِ علم پر ہے جو اپنی زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان طلبا اور طالبات کے ذہن کو متاثر کر سکیں۔ وقت کی مجبوریاں مجھے اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ میں استاد کی خصوصیات یا اس کے فرائض پر تفصیل سے تبصرہ کروں۔ اسلامی ادب اس بارے میں مثالوں سے معمور ہے لیکن سرِ دست میں کتاب البدء والخلق والتاریخ کے مقدمہ کے ایک حوالہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس کتاب کا مصنف مطہر ابن طاہر المقدسی (۳۵۵ھ مطابق ۹۹۶ء) ہے۔ اس مقدمہ میں اس نے بعض معاصر علماء کے نقطۂ نظر کو قابلِ ملامت قرار دیا ہے اور ان کے سامنے تعلیم اور حصولِ علم کا صحیح معیار پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے:۔

"علم صرف اسی کے سامنے نقاب کشائی کرتا ہے جو اپنے آپ کو اس کے روبرو مخلصانہ طور پر پیش کرے جو اس کی جانب صاف ذہن اور واضح بصیرت کے ساتھ قدم بڑھائے جو خدا کی امداد کا طالب رہے اور اپنی تمام تر توجہ اسی کی طرف مبذول کرتا رہے جو کمرِ ہمت باندھے اور محض

شوق کی خاطر بے خواب راتیں گزارے اور بتدریج بلند منزلوں کو جا پہنچے۔ علم کسی ایسے شخص کے سینے کو منور نہیں کرتا جو بے مقصد بھاگ دوڑ اور بے کار کوشش کرے یا جو ایک اندھے اونٹ کی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے۔ حصول علم کی اولیں شرط یہ ہے کہ بری عادتوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیے جائیں اور مذموم رجحانات کو غالب آنے نہ دیا جائے۔ علم کے سچے متلاشی کو صداقت کے راستے سے منہ نہیں موڑنا چاہیئے اس کو حق و باطل کے مابین امتیاز کرنا چاہیئے۔ خالص اور جعلی کی پہچان ہونی چاہیئے اور اس کو عقل کی صاف روشنی کے باعث ثابت قدم رہنا چاہیئے۔"

مطہر بن طاہر سے ایک ہزار برس بعد ایک اور بہت بڑے فلسفی برٹرنڈ رسل نے استاد کی کامیابی کی مندرجہ ذیل شرائط مقرر کی ہیں:۔

"استاد بھی ایک فن کار فلسفی اور ادیب کی طرح صرف اس حالت میں اپنے کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا ہے۔ جب وہ یہ محسوس کرے کہ اس کے فرض کی متحرک کوئی تخلیقی داخلی قوت ہے اور کسی خارجی قوت کا رعب اس کی کارکردگی کا باعث نہیں ہے۔"

میرا یہ منصب نہیں کہ یہ کہوں کہ آیا ہماری یونیورسٹی میں اس صلاحیت کے اساتذہ موجود ہیں یا نہیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ استاد کا فرض ہے کہ اپنے شاگردوں کے لئے ایسے گوشے وا کرے جو ان پر ایسی سرگرمیوں کے امکانات واضح کریں جو مفید بھی ہوں اور خوشگوار بھی اور سب سے پہلے ایک استاد کو جو شے اپنے شاگرد کے ذہن نشین کرنی چاہیئے اور جو جمہوریت کی بقا کے لیے ازبس ضروری ہے وہ اس قسم کا تحمل ہے جو دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے اور جانچنے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔

ہماری جامعی زندگی کا ایک اور پہلو بھی ہے جو مجھے اس سے بھی زیادہ نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے وہ پہلو معاشرتی ہے جو کردار کی نشوونما کے لیے محض رسمی تحصیل علم سے زیادہ ضروری ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کا طغرائے امتیاز یہی رہا ہے اگرچہ اس بات کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان درسگاہوں کا ہر فارغ التحصیل علم کا شائق ہے۔ درحقیقت وہاں بھی کئی ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو بالکل کام نہیں کرتے مگر اس حقیقت کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہر وہ انڈر گریجویٹ جو زندگی کے تین یا چار سال کالج یا یونیورسٹی میں گزارنے کے بعد وہاں سے نکلتا ہے وہ ایک بہتر انسان اور بہتر شہری ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی زندگی کے اس پہلو کی جانب خاص اشارہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی

بھی پاکستان کے حیاتِ عمومی میں یہ مفید کام سرانجام دے سکتی ہے۔ جس کی اشد ضرورت ہے۔ میرے نزدیک موجودہ دور میں ملک کی سب سے بڑی ضرورت زیادہ سے زیادہ بھائی چارہ ہے۔ جس کو (E SPAER DE COAP) کہتے ہیں۔ بھائی چارے کے اس جذبہ کے تحت افراد اپنی انفرادی اغراض کو بڑے وسیع مقصد میں مدغم کر دیتے ہیں۔ اس جذبہ کے تحت گروہوں کو وسیع تر اجتماعی اکائیوں کا ادراک حاصل ہوتا ہے اور فرقہ بندیاں قوم بندی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے کالجوں میں سوشل سروس کے لئے ایک لیگ قائم کی جانی چاہیئے۔ اس لیگ کے اراکین کے لئے مذکورہ بالا بھائی چارہ کے مقاصد کا اقرار کرنا ضروری ہو اور اس کا اظہار عملی طور پر بھی ہونا چاہیئے۔ اس برادری کے اراکین کو غربت اور دیگر انسانی مصائب کے دور کرنے میں عملی کام کرنا چاہیئے۔ وبائی امراض کا مقابلہ، آتش زنی کی وارداتوں کا استیصال، سیلابوں کی روک تھام اور مفلوک الحال لوگوں کی امداد اس کے فرائض میں داخل ہونے چاہئیں آغاز اسلام سے تا ایں دم سوشل سروس اسلام کا طغرائے امتیاز رہا ہے اور مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جن نوجوان اصحاب و خواتین سے میں خطاب کر رہا ہوں وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے سوشل سروس یونٹ

امداد باہمی کے اصول پر قائم کریں گے اور اس طرح عوام کی اصلاح اور ترقی کا باعث بنیں گے جو آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اس قسم کا خطبہ ختم کرنے سے قبل ان طلبا اور طالبات کو جنہوں نے ڈگریاں حاصل کی ہیں اور جو زندگی کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے والے ہیں، پند و نصائح کرنا ایک رسم بن گئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس حرکت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ غیر مطلوبہ نصیحت پر کوئی کان نہیں دھرتا بلکہ برعکس اس کے یہ ہوتا ہے کہ ایسے نوجوانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے جو ضمنی اعزاز حاصل کرنے پر قدرتی طور سے خوش ہوتے ہیں اور اب انہیں پند و نصائح سننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ہمدردی کی زیادہ ضرورت اس کو ہے جو خطبہ تقسیم اسناد پیش کر رہا ہے کیونکہ اس کو اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ان مواقع پر جو چیز کہی جا سکتی تھی وہ اس سے پہلے ہی زیادہ بہتر طریقے پر کہی جا چکی ہے بہر حال رسم کی طاقت بھی بہت بڑی ہے۔ بالخصوص مجھ ایسے عمر رسیدہ کے لئے اور مجھے امید ہے کہ میرے الفاظ سے غلط مفہوم اخذ نہیں کیا جائے گا۔ آغازِ کار میں میں اس سال کے تمام گریجوایٹوں کی خدمت میں اس نصاب کے خاتمے اور ڈگریوں کے حصول پر جو ان کی کامیابی کی علامت ہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نوجوانوں کے اس علم دوست

گروہ سے جنہیں یونیورسٹی نے آج ڈگریاں عطا کی ہیں یہ توقع رکھتا ہوں کہ ان کے زندگی کی ہماہمی میں مصروف ہونے تک اس یونیورسٹی میں بھی یہ تحریک شروع ہو جائے گی جس سے ریسرچ کے کام میں نئی نئی راہیں کھل سکیں جو اس سے قبل ہم سے پوشیدہ رہی ہیں، کیونکہ سائنس میں ریسرچ اور آرٹس میں تخلیقی کام ہی دو ایسے وظائف ہیں جو کوئی یونیورسٹی قومی زندگی کی بہبود کے لیے بہم پہنچا سکتی ہے۔ بہرحال ہماری تہذیب کی تاریخ میں کئی ایسے گوشے ہیں جن کی ابھی تک تلاش ضروری ہے۔ ان کی جانب توجہ کرنا ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ کیونکہ جرمن، ولندیز، فرانسیسی، اطالوی، برطانوی اور امریکی متشرقین کی مساعی کو حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا چاہے انسانی کنبہ کی دور دراز شاخوں کے بارے میں ان کی ہمدردی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو اور نہ ہی انہیں ان اقدار کا آخری جائزہ لینے کے لئے پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے جن کی جڑیں ہمارے ماضی میں گہری ہو چکی ہیں۔

اے میرے نوجوان دوستو! آپ پر ہمارے ماضی اور اپنے مستقبل کی تعمیر کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ فرض اور عزت کی دعوت نوجوانوں کے لئے خاص کشش کی حامل ہے۔ آپ کے لئے شاندار مواقع ہیں۔ مذہب اور کلچر، معاشرتی اوصاف اور

امن کی اقدار جو ہمیں نہایت عزیز ہیں اس جذبے کے ساتھ قائم رہنی چاہئیں جس جذبے کے ساتھ آپ زمانے کے چیلنج کا مقابلہ کرتے ہیں۔

دوسروں کو میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا مقصد تخلیق بنائیں اور تخریب سے اجتناب کریں۔ اختلافات کے باوجود مصالحت کرنا سیکھیں جن سے آپ کو اختلاف ہو۔ ان کے خیالات کا بھی احترام کرنا لازم ہے۔ آپ کی تکالیف کا وجود اس لئے ہے کہ ان پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ آغازِ منزلِ حیات میں آپ کو کسی چیز سے بے حوصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ افہام و تفہیم میں ہمدردی، فیصلے میں انصاف، ناقدانہ تحسین اور حسن و قبح میں امتیاز کرنا شعار بنایا جائے۔ گوئٹے نے کہا ہے :

"کام کرنا آسان ہے مگر سوچنا مشکل ہے"۔

علم کا مقصود ہی فکر ہے، ناقدانہ نظر سے سوچنا اور مروّجہ خیالات کی قوت سے بے پرواہ ہو کر سوچنا اور اس کے علاوہ غیر ثابت شدہ معتقدات کو مسترد کر دینے کی قابلیت رکھنا خواہ وہ کتنے ہی جاذبِ نظر کیوں نہ ہوں۔

اسلام میں زندگی سے فرار کا کوئی جواز موجود نہیں بلکہ وہ مسلسل جدوجہد اور ترقی کا داعی ہے اور اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے

کے لئے دنیاداری سے نفرت کی حاجت نہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو اپنے ماحول کے تمام مسائل میں گہری دلچسپی لینے اور مشکلات اور دشواریوں پر عبور حاصل کر لینے کی تلقین کرتا ہے۔ مسلمانوں کو بڑے سے بڑے ابتلا کے وقت بھی ثابت قدم رہنے اور مصائب کا صبر و تحمل اور بہادری سے مقابلہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ وہ مسلمانوں پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی تعلیمات کے سانچے میں اس طرح ڈھالیں کہ ان کا اخلاق اور طرزِ عمل اس کی دینی تعلیمات کا عکسِ حسین بن جائے۔

خواتین و حضرات! اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنائیں۔ آپ مستقبل کے ضامن ہیں۔ آپ اس دنیا میں کیا کردار ادا کریں گے یا آپ کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس بارے میں کوئی حتمی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی مگر ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کے استحکام اور تقویت اور ملت کی پاسبانی کے علاوہ علم اسلام کو سربلند رکھنے کی تمام تر ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔ اس لئے وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے کہ آپ قوم و ملک کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کریں اور اپنی بہترین علمی اور عملی صلاحیتیں قوم کی نذر کر دیں۔ خدمت کا میدان بڑا وسیع ہے اب جبکہ خدا کے فضل و کرم سے آپ کا ملک آزاد اقوام کی برادری کا ایک معزز رکن ہے، قومی وقار اور عزتِ وطن متقاضی ہے کہ آپ اس عظیم فرض کو انجام دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جائیں۔ ملک و ملت کو آپ کی ضرورت ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان کی توقعات کو پورا کریں گے۔

"پاکستان پائندہ باد"

اسلامی ممالک میں تعلیم

(مذہبی تعلیم سے متعلق مسائل)

آئندہ صفحات میں جو خطبہ درج ہے وہ جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے ۱۱ ستمبر ۱۹۵۳ء کو ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آپ نے بطورِ خاص اسلامی ممالک میں مذہبی تعلیم اور اس سے متعلقہ مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس خطبہ میں آپ نے تعلیم کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی۔ "تعلیم انسانی معاشرے کے بالغ ارکان کی طرف سے ایک بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ آنے والی نسلوں کی نشو و نما کا سانچہ اپنے مقاصدِ زندگی کے مطابق تیار کیا جائے۔"

آپ نے اس خطبہ میں اس بات پر زور دیا اور اس کی طرف توجہ دلائی کہ:-

"اب وقت کا تقاضا ہے کہ تعلیمی مقاصد کی وہ وحدت بحال کی جائے جو اسلام کے دورِ اوّل میں تھی۔ مذہب معاشرے میں سیمنٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن نے جس فکر و نظر کی دعوت دی ہے اگر ہم نے اسے ترک کر دیا اور ان صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لائے جو قدرت نے ہمیں سونپی ہیں تو ہم کبھی زندگی کے بنیادی مقاصد کو حاصل نہ کر سکیں گے۔"

اسلامی ممالک میں تعلیم

(مذہبی تعلیم سے متعلق مسائل)

تمہید کسی قوم میں جو طریق تعلیم نشو و ارتقا پاتا ہے، وہ اس کی اجتماعی زندگی کا ایک نہایت اہم اور حد درجہ امتیازی ادارہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ہر قوم کی فطرت و طبیعت اور روحانی خصائل کا مظہر ہوتا ہے اس لئے جو لوگ اس قوم کی رُوحانی اور ذہنی زندگی کو سمجھنے کے خواہاں ہوں ان کے لئے اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ اس کی معنویت اور قدر و قیمت محض یہیں تک محدود نہیں کہ اس سے نشو و ارتقا دینے والی قوم کا کردار نمایاں ہوتا ہے بلکہ ایک مرتبہ قائم ہو چکنے کے بعد وہ قوم کے مزید نشو و ارتقا کے لئے ایک زبردست ترکیبی عامل

بھی بن جاتا ہے۔ اس طرح قوم کے مقاصد اور ذہنی زندگی کی وضع و ہیئت کو استقلال بخشنے میں معاون ہوتا ہے۔ اس (فلسفیانہ) نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو اسلامی تعلیم کا نظام نہایت اہم معاملے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے موجودہ مرحلہ ایسا ہے جس میں اسلامی دنیا کے تقریباً تمام حصوں کے اندر تعلیمی نظام کم و بیش تیزی سے بدل رہا ہے لہٰذا ہمارے لئے اس کا مطالعہ خاص دلچسپی کا موجب ہے۔

تعلیم کا تصور اور اُس کے اغراض و مقاصد:

"تعلیم کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا"۔ اس مقولے کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے تعلیم کا بیڑا اٹھا رکھا ہے ان کے پیش نظر مقاصد کیا ہیں؟ ایک منظم معاشرے میں تعلیم مملکت کی بہبود کے لئے حد درجہ ضروری ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ اچھے انسان اور اچھے شہری پیدا کرے۔ تعلیم کی غرض و غایت یوں بیان کی گئی ہے۔ "یہ انسانی معاشرے کے بالغ اراکان کی طرف سے ایک کوشش ہوتی ہے کہ آنے والی نسلوں کی نشو و نما کا سانچا اپنے مقاصدِ زندگی کے مطابق رکھا جائے" جان سٹوارٹ مل[۵] نے اس میں ہر وہ چیز شامل کر دی ہے جس سے انسانوں کی

---

۵ J. S. MILL

صحیح تشکیل میں مدد ملے لاک[1] نے اپنے تعلیمی تصور صحت مند جسم میں صحت مند قلب و ذہن کی تخلیق۔ کو بروئے کار لانے کا طریقہ یہ تجویز کیا کہ تعلیم یافتہ افراد میں نیک عادات، اچھا ذہن و فہم اور عقل و دانش کو فروغ دیا جائے جس سے ان میں اپنے معاملات سنبھال لینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اچھی تربیت اور حصولِ علم کو اس کے نزدیک کم سے کم اہمیت حاصل تھی۔ البتہ اسے اخلاقی تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کو بھی اہم قرار دیا۔ اس طرح وہ امام غزالیؒ کے نقشِ قدم پر چلا۔ جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی میں اس خیال کی تردید کر دی تھی کہ تعلیم کا مقصد صرف علم کی اشاعت ہے۔ اس کے برعکس حضرت امامؒ نے اس ضرورت پر زور دیا کہ طالب علم کا اخلاقی و مذہبی شعور بیدار کرنا چاہیئے۔

ہربرٹ سپنسر[2] کے نزدیک تعلیم کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ فرد کو "پاکیزہ اور بے داغ زندگی" بسر کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعلیم کا کوئی منصوبہ اس وقت تک معقول اور کامیاب نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک اس میں قوم کی اخلاقی مجلسی اور ثقافتی ضرورتیں پیشِ نظر نہ رکھی جائیں۔

ایک سوال یہ ہے کہ آیا تعلیم بجائے خود ایک مقصد ہے یا کسی مقصد کے لئے ایک ذریعے کی حیثیت رکھتی ہے؟ یہ سوال بہت وسیع و پیچ ہے اور تعلیم

۱ـ LOCKE ۲ـ HERBERT SPENCER

کے مقاصد، موضوعات اور طرز و طریق کے پورے دائرے پر حاوی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا ارفع و اعلیٰ مقصد صرف تعلیم ہے یعنی یہ کہ علم ذہنی تفریح و تسکین کے لئے حاصل کیا جائے لیکن اس نصب العین کو صرف چند خوش نصیب لوگ ہی اپنا سکتے ہیں۔ عوام کے تعلق میں ضروری ہے کہ تعلیم ایک مقصد کے لئے ذریعہ تصور کیا جائے۔ تعلیم کا مطلب یہ نہیں کہ بچے کے ذہن میں بعض ایسی بنیادی باتیں ٹھونس دی جائیں جن کی بنا پر اسے علم کا اوّل درجہ حاصل ہو جائے۔ محض علم حاصل کر لینے سے فہم و بصیرت کے لئے وہ وسیع بنیاد مہیا نہیں ہو سکتی جو ایک آزاد قوم کے شہری کی حیثیت میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے حد درجہ ضروری ہے۔

اسلام اور تعلیم کی اہمیّت

اسلام نے عربوں میں تعلیم کے مبادی ہی جاری نہ کیے جن سے وہ بے بہرہ تھے بلکہ تہذیب و تمدن کو بھی انتہائی بلندی پر پہنچا دیا۔ قرآن مجید علم و حکمت کی اعلیٰ قدر و منزلت پر شاہد عادل ہے۔ عربوں میں بحیثیت قوم نوشت و خواند کا رواج نہ تھا۔ بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ خود رسُولِ اکرم (صلعم) نے کہیں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا لیکن دیکھئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں آپ کو حکم دیا گیا کہ "پڑھ" (اِقرأ) اس حکم کی

اہمیت تیسری آیت سے واضح ہوتی ہے جہاں پڑھنے کا ارشاد دہرایا گیا ساتھ ہی فرمایا کہ "تیرا رب بڑا کریم ہے" (اقراء وربك الاكرم) اور بتا دیا کہ پڑھنے لکھنے ہی سے انسان عظمت کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ خود رسولِ اکرم (صلعم) نے تحصیل علم کی اہمیت مختلف ارشادات میں واضح فرمائی۔ ایک موقع پر فرمایا ہر مسلم مرد اور عورت کا فرض ہے کہ علم کی تلاش میں چین بھی چلا جائے ذیل کا ارشاد نہایت جامع بھی ہے اور نہایت اہم بھی، کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لئے یہی لازم قرار نہیں دیا گیا کہ وہ علم حاصل کریں۔ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ انہیں کیوں علم حاصل کرنا چاہیئے؟ ارشاد ہوا:۔ "علم حاصل کرو، کیونکہ علم حاصل کرنا اللہ کی راہ میں عمل خیر انجام دینا ہے، علم کی بات چیت کرنا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے۔ اس کی تلاش میں نکلنا خدا کی عبادت ہے۔ دوسروں کو علم سکھانا خیرات ہے اور علم کو اس کے اہل تک پہنچانا خدا کی بندگی کا حق ادا کرنا ہے، علم صاحب علم کو ممنوع اور غیر ممنوع کے درمیان تمیز کے قابل بناتا ہے یہ عالم بالا تک راستہ منور کر دیتا ہے۔ دشت و بیاباں میں ہمارا دوست اور خلوت میں ہمارے لئے انجمن ہے۔ دوست ہم سے بچھڑ جائیں تو علم ہمارا رفیق ہوتا ہے یہ راحت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے مصیبت میں ہمیں سہارا دیتا ہے مجلس احباب میں ہمارا زیور ہے دشمنوں کے مقابلے میں ہمارے لئے زرہ بکتر کا کام دیتا ہے، علم کی برکت سے خدا کا بندہ خیر و صلاح کی بلندیوں پر

پہنچ جاتا ہے۔ اس دنیا میں بادشاہوں کا مصاحب بنتا ہے اور اگلی دنیا میں پوری فلاح وکامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے"۔

اِسلامی تعلیم کے مضامین

مسلمان اپنی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور سے مجلسی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم کو بھی مذہب سے وابستہ رکھنے کے عادی رہے۔ شروع ہی سے تعلیم کا مقصد مذہبی تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب ہی تعلیم تھا۔ حقیقی تعلیم کے بارے میں عقیدہ ہی یہ تھا کہ تعلیم کا مقصد انسان کو خالق اور ہم جنس کے تعلق میں فرائض کی تعلیم و تربیت دینا ہے۔ چنانچہ ابتدائی دور کے مسلمان کلامِ الٰہی کے کچھ حصے حفظ کر لیتے تھے اور قرآن ہی ان کی مذہبی، اخلاقی، مجلسی اور آئینی زندگی کا واحد ضابطہ تھا۔ جب رسولِ اکرم (صلعم) نے ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے تو علم سے حضورؐ کا مقصود وہی پاک کلام تھا جو حضورؐ پر الہام کے ذریعے سے دنیا تک پہنچا۔

حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تعلیم کا خاص مفہوم یہ تھا کہ کلام پاک کے مختلف اجزاء حفظ کر لئے جائیں اور اصولِ اسلام سیکھ لئے جائیں۔ اگرچہ حضورؐ بہ نفسِ نفیس لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے لیکن لکھنے کو حضورؐ کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس کے ذریعے سے اشاعتِ علم میں مدد ملتی تھی۔ مشہور غزوہ بدر

کے ایک واقعے سے اس کی بخوبی توضیح ہوتی ہے۔ بدر کے میدان میں لشکر مخالف کا ایک گروہ اسیر ہو گیا تھا اسے مدینہ منورہ لے گئے۔ جب ان لوگوں کو ادائے فدیہ پر رہا کر دینے کا فیصلہ ہو گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض غریبی اور مسکینی کے باعث فدیہ ادا ہی نہیں کر سکتے اور رقم کی مقدار فی کس چار ہزار درہم مقرر کر دی گئی تھی۔ رسول اکرم (صلعم) نے حکم دیا کہ اسیروں میں سے جو لوگ دس دس بچوں کو تعلیم دے کر خواندہ بنا دیں گے انہیں (فدیہ لئے بغیر) رہا کر دیا جائے گا جب طلبہ میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تو قیدی رہا کر دیئے گئے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت بھی مدینہ منورہ کے انہیں بچوں میں سے تھے جنہوں نے اس طریق پر تعلیم پائی اور وہ آگے چل کر رسول اکرم (صلعم) کی خدمت میں کاتب کے فرائض انجام دیتے رہے اسی حیثیت میں انہوں نے کاتب وحی ہونے کا بھی شرف حاصل کیا۔ کچھ مدت بعد رسول اکرم (صلعم) نے حضرت زیدؓ کو عبرانی رسم الخط سیکھنے کا حکم دے دیا جو اس زمانے میں یہود مدینہ کے درمیان رائج تھا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں عربوں کی توجہات تقریباً تمام تر ان علاقوں میں اسلامی نظام قائم کر دینے کے لئے وقف رہیں جو نئے نئے مسخر ہوئے تھے، لہٰذا انہیں تعلیم کے نشوونما اور توسیع کے لئے بہت کم وقت مل سکا۔

اور اس زمانے میں تعلیم کا بڑا مقصد اصول اسلام سکھانے ہی تک محدود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اساتذہ "قراء" کہلاتے تھے یعنی قرآن پڑھنے والے جنہوں نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور دوسروں کو حفظ کراتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان قراء کی ایک جماعت اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں بھیجی اور حکم دے دیا کہ وہ لوگوں سے ربط ضبط پیدا کریں خصوصاً ان بڑی مسجدوں میں پہنچیں جہاں مسلمان نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔

جب اسلامی مملکت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں تو تعلیم کا ایک ابتدائی نظام وجود میں آ گیا۔ اس میں علم کے مبادی سکھائے جاتے تھے اور ہمیں تاریخ میں ایک ابتدائی مدرسے کے اشارے ملتے ہیں جو ایک "معلّم" نے جاری کر رکھا تھا۔ بنی امیّہ کی حکومت کے شروع ہی میں ابتدائی تعلیم کا نظام پوری طرح جاری ہو گیا تھا۔ عام لوگ تلاش علم میں مسجدوں کا رخ کرتے جو عبادت گاہیں بھی تھیں اور تعلیمی مرکزوں کا کام بھی دیتی تھیں۔ جب بچہ چھ سال کا ہو جاتا تو سمجھا جاتا کہ وہ باقاعدہ تعلیم پانے کے لائق ہے۔ جداگانہ عمارتیں، دکانیں یا گھر بھی ابتدائی درسگاہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور انہیں "کُتّاب" کہا جاتا تھا تعلیم کی ابتدا قرآن خوانی سے ہوتی۔ ساتھ ساتھ نہایت اہم مذہبی اصول و معمولات کی تعلیم دی جاتی۔ مثلاً وضو کیونکر کیا جائے؟ نماز کے دوران میں قرآن کیونکر پڑھا جائے؟ نماز با جماعت کا طریقہ کیا ہے؟ بچوں کو لکھنا بھی

سکھایا جاتا۔ اس مقصد کے لئے وہ تختیوں سے کام لیتے۔ حساب کے ابتدائی قاعدے بھی انہیں سکھا دیئے جاتے۔ رسولِ اکرم (صلعم) کی حیاتِ طیبہ کے مختلف واقعات کے علاوہ بزرگوں کی سبق آموز کہانیاں بھی سکھائی جاتیں سب سے آخر میں طلبہ کو مشہور شعراء کے منتخب اشعار پڑھائے جاتے۔ یوں ابتدائی تعلیم مکمل ہو جاتی۔

عباسی خلفاء برسرِ اقتدار آئے تو مملکت اسلامیہ میں درخشاں اقبال مندی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ امن کا دور دورہ تھا۔ اقتصادی خوشحالی کے ساتھ ذہنی سرگرمیوں کا ایک غیر معمولی سیل امڈ آیا جس کی نظیر سرزمینِ مشرق نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہی دور ہے جس میں مسلمان قدیم یونان، ایران اور ہندوستان کے فلسفہ و حکمت سے روشناس ہوئے۔ یوں ان کی ذہنی فضا بہت وسعت اختیار کر گئی۔ یہ وسیع ذہنی دلچسپیاں نصاب ناموں میں بھی منعکس ہوئیں۔ پھر انہیں اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں میں شامل نصاب کر لیا گیا جو قائم ہو چکی تھیں اور انہیں "مدارس" کہتے تھے۔ "مدارس" میں مضامین مطالعہ کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ اوّل علومِ نقلیہ یعنی مذہبی علوم، جن میں قرآن، حدیث، فقہ اور ادب شامل تھے۔ دوم علوم عقلیہ، ذہنی علوم، جو فلسفہ، ریاضی، ہیئت، طبیعیات، کیمیا، طب وغیرہ پر مشتمل تھے۔ وقت اور جگہ کی تنگی کے باعث یہاں اُن مضامینِ نصاب کا تفصیلی

جائزہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ ایسے کالج اور یونیورسٹیاں وقتاً فوقتاً سلطنت کے دور افتادہ حصوں میں بھی قائم ہوتی رہیں۔ اس اعزاز کا سہرا المامون کے سر ہے جس نے ۸۳۰ء میں بہ مقام بغداد "بیت الحکمت" کی بنیاد رکھی جو اعلیٰ سائنٹیفک علوم کا ادارہ تھا لیکن "نظامیہ"، "مستنصریہ" اور "جامع الازہر" کم اہم نہ تھے اور انہوں نے اسلامی تعلیم کے نشوو ارتقا میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

جو کچھ اوپر عرض کیا جا چکا ہے اس سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام میں تعلیم ابتدا ہی سے بلحاظ عمومی، مذہبی اور بہ اعتبار مقصد اخلاقی رہی۔ کتب نصاب میں ایک خاص یکجہتی تھی جس کی بنا پر دنیوی اور مذہبی تعلیم کے درمیان امتیاز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ حق یہ ہے کہ حقیقی اسلامی معاشرے میں اس قسم کا سوال بروئے کار آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسلام میں مذہب زندگی سے کوئی الگ شے نہیں اور یہ کوئی الہیاتی اصول کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ مختلف پہلوؤں میں ہر مسلمان کی روزمرہ زندگی پر حاوی ہے اور معمولی سے معمولی تفصیلات بھی اس سے باہر نہیں جا سکتیں، لہٰذا تعلیم جیسی اہم مجلسی سرگرمی مسلمانوں کے عام مذہبی نقطۂ نظر سے بیگانہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کو حسن اخلاقی اصول بھی شامل

ہیں کیوں اسلام میں تعلیم کا اوّل و آخر سمجھا گیا اور کیوں مختلف مراحل پر نصاب کا مغز اور قشر قرار دیا گیا؟

اسلامی تعلیم کی مذہبی خصوصیت ہر دور میں برابر قائم رہی۔ آج بھی مسلمان بچہ ابجد سیکھ کر پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اکثر حالات میں سب سے پہلے اسے قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صرف انہیں ملکوں میں رائج نہیں جن کی زبان عربی ہے بلکہ ان اسلامی ملکوں میں بھی رائج ہے جہاں عربی زبان کا علم تعلیم یافتہ طبقے کے چھوٹے سے حصے تک محدود ہے۔ اسی طریق عمل کا نتیجہ ہے کہ اسلامی دنیا کا تقریباً ہر فرد جس نے عام رواج کے مطابق تعلیم پائی قرآن پڑھ سکتا ہے اس طرح قرآن مجید کی اصل زبان سے راہ و ربط پیدا کر لیتا ہے۔ یہی مقدس کتاب اس کے مذہبی اور اخلاقی افکار کا سرچشمہ ہے۔ رہا یہ امر کہ اس نوع کا ربط ضبط زندگی میں حقیقتہً کیونکر بار آور ہو گا تو اس کا انحصار بہت سے دوسرے عوامل پر ہے۔

اسلامی ہند میں تعلیم

ہندوستان کے مسلمان شہنشاہ تاریخ میں بڑے فاتحین، قابل ناظم و مدبر اور عالی شان عمارتوں کے بانی ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے علم کی سرپرستی بھی فیاضی و فراخ حوصلگی سے کی اور اپنی وسیع مملکت میں تعلیم کو فروغ دیا۔

ان میں سے بعض شہنشاہوں کے عہدِ حکومت کو ادبی اور تعلیمی اعتبار سے وہی حیثیت حاصل تھی جو فصلِ بہار میں باغوں کو حاصل ہوتی ہے۔ شہنشاہوں اور ان کے امراء نے ملک کے ہر حصے میں مکتب اور مدرسے قائم کر دیئے اور ان کے دروازے رعایا کے تمام طبقوں کے لئے کھلے تھے۔ مسجدیں صرف اسی تعلیم کے لئے وقف تھیں جس کے نصاب میں مذہب کو نہایت اہم حیثیت حاصل تھی۔ خاص مقصد یہ تھا کہ مذہبی تعلیم دی جائے۔ ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے اور حساب کتاب رکھنے کے بارے میں ابتدائی معلومات سکھادی جائیں۔ مدرسے اعلیٰ تعلیم کے ادارے تھے۔ یہ یا تو مسجدوں سے وابستہ رکھے جاتے تھے یا بزرگوں کی خانقاہوں سے۔ نصاب کا اہم حصہ قرآن، حدیث اور علم کلام پر مبنی تھا۔ مجلسی علوم اور مذہب دونوں چیزیں نصاب میں شامل تھیں یوں دینی اور دنیوی تعلیم کو یکجا کر دیا گیا تھا۔

بانیوں نے زمینیں وقف کر دی تھیں جن کی آمدنی سے مدرسوں کا خرچ پورا ہوتا تھا۔ وقف جائدادوں کی آمدنی سے اساتذہ کو مشاہرے اور طلبہ کو وظیفے دیئے جاتے تھے۔ ان مدرسوں کے علاوہ جو خاص اوقاف کی بنا پر قائم تھے مغل شہنشاہوں نے اشاعتِ تعلیم کا ایک اور منصوبہ بھی تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے ممتاز علماء کے لئے مناسب رقمیں مقرر کر دیں جو سلطنت کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے مقصد یہ تھا کہ وہ معاش کی پریشانیوں

سے فارغ ہو کر پوری توجہ تعلیم پر صرف کردیں۔ اس انتظام سے ہندو اور مسلمان علماء یکساں مستفید ہوئے۔ بعض خاندانوں میں اب تک وہ شاہی فرمان اور سندیں محفوظ ہیں جن کے مطابق اہل علم کو مالی وظائف دیئے گئے تھے شہنشاہ جہانگیر نے مدرسوں کے مصارفِ نگہداشت کے لئے آمدنی کا ایک اور ذریعہ تلاش کر لیا اس نے فرمان جاری کر دیا کہ جب کوئی دولت مند آدمی بے وصیت مر جائے اور جائز وارث کوئی نہ ہو تو اس کی جائداد حکومت کی نگرانی میں لے لی جائے اور آمدنی مدرسوں نیز مسافر خانوں کے مصارف میں استعمال ہو۔ اس فرمان کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو پرانی درسگاہیں وسائل کی کمی کے باعث بند ہو گئی تھیں وہ شائق طلبہ اور اساتذہ نے دوبارہ جاری کر لیں۔ جہانگیر نے "تزک" میں آگرہ کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے "اس مقام کے شہری علم کے اتنے پیاسے ہیں کہ ہر مذہب اور قوم کے علماء یہاں بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں"

علم کی سرپرستی اور تعلیم کی اشاعت شہنشاہوں تک ہی محدود نہ تھی۔ سلطنت کے امراء اور اکابر بھی تعلیم کی خدمت گزاری میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے کوشاں تھے مثلاً شہنشاہ اکبر کے نامور وزیر ابوالفضل نے سلطنت کے نو تعمیر دارالحکومت فتح پور سیکری میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور شہنشاہ کی رضاعی ماں نے دہلی میں ایک کالج قائم کر دیا تھا جس کا نام "خیر المنازل" تھا۔

مغل شہنشاہوں اور امراء کو تعلیم سے جو اس قدر دلچسپی تھی تو اس کے متعدد وجوہ تھے۔ اول وہ خود تعلیم یافتہ بلکہ فاضل تھے اور انہیں طبعاً تعلیم سے گہرا شغف تھا۔ دوم تعلیمی نصاب میں مذہبی مضامین ضرور شامل ہوتے تھے لہٰذا وہ ان علماء کی امداد کارِ ثواب سمجھتے تھے جو ان مضامین کی تعلیم میں مشغول تھے، یہ نہایت اہم اور سبق آموز امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ سرکاری امداد کی بنا پر چلنے والے اداروں کے علاوہ ایسے علماء بھی موجود تھے جو وسائل معاش میں کسی کے محتاج نہ تھے اور انہوں نے سرکاری امداد سے بالکل بے نیاز ہو کر زندگیاں اشاعت علم کے لئے وقف کر دیں۔

برطانوی ہند میں تعلیم

برطانوی اقتدار کے بعد ملک براہِ راست مغرب کے زیر اثر آگیا جو قومی زندگی کے تقریباً تمام دائروں میں کم یا زیادہ محسوس ہوا۔ نو واردوں نے یہاں پہنچکر بہت سے مکتب دیکھے جن میں ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اور بیشمار مدرسے بھی موجود پائے جہاں اعلیٰ تعلیم کا انتظام تھا۔ ان دونوں کی کیفیت اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ عہد حکومت کے آغاز میں رعایا کی تعلیم کے متعلق انگریزوں کی روش منفی تھی۔ تعلیم کے پرانے اداروں کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ کم از کم ۱۸۱۳ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے عوام کی تعلیم کو اپنی ذمہ داری ہی نہیں

سمجھا تھا۔ اس سال (۱۸۱۳ء) کمپنی کے لیے چارٹر (اجازت نامہ) کا جو قانون منظور ہوا اس میں پہلی مرتبہ یہ انتظام کیا گیا کہ "ملکی ادب کے احیاء و اصلاح اور تعلیم یافتہ باشندوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔" لیکن دیسی باشندوں کو انگریزی تعلیم دینے کے متعلق پسند و ناپسند کے باب میں شدید اختلاف رائے تھا۔ تعلیم کے متعلق یہ اختلاف آخر ۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے[1] کی یادداشت نے ختم کیا۔ اس وقت تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کو تربیت دے کر نظم و نسق ملک میں امداد کے لیے تیار کیا جائے" اس بنا پر وقت کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ[2] نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک قرارداد شائع کی جس میں بتایا گیا، برطانوی حکومت کا ایک بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ باشندگانِ ہند میں یورپی علوم و ادب کو فروغ دے اور جو سرمایہ تعلیم کے لیے میزانیے میں مہیا کیا جائے اس کا بہترین مصرف صرف انگریزی تعلیم ہو سکتی ہے" یوں مغربی علوم پر توجہ کو خاص نصب العین بنایا گیا اور جولائی ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وڈ[3] کے مراسلے نے اس کی توثیق کر دی۔ یہی مراسلہ "ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا منشورِ اعظم" کہلاتا ہے۔ حکومت نے وقتاً فوقتاً متعدد کمیشن بھی ترتیب دیئے اور کمیٹیاں بھی بنائیں لیکن ان کی سفارشوں پر غور و بحث غیر ضروری ہے۔ ہمارے مقصد کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ سائمن کمیشن

---

[1] Macawley [2] William Bentick [3] Charles Wood

کی " ہارٹوگ کمیٹی"[1] کا حوالہ دے دیں جو ۱۹۲۸ء میں بنی تھی۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ " برطانوی ہند میں معیارِ تعلیم کی چھان بین کی جائے۔ اس کا بڑا مقصد یہ ہو کہ نئے ہندوستان میں حق رائے کی توسیع کا جواز فراہم کرنے کے لئے معلومات فراہم کی جائیں"۔ یہی مسئلہ اس وقت در پیش تھا۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ " خاص مدارس کا بڑے پیمانے پر جاری رہنا (جن کے نصاب تعلیم میں اسلامی ثقافت اور مذہب شامل تھے) مسلمانوں کے مفاد کے لئے نقصان رساں ہے" اور وقت آگیا ہے ــــ بلکہ اب سے پہلے آچکا ہے۔ کہ ایسی سیاسی تدابیر وضع کرنے کے لئے زبردست کوشش کی جائے جن کے مطابق ان سکولوں کے طلبہ عام سکولوں اور کالجوں میں منتقل کر دیئے جائیں۔

نئے نمونے کے سکولوں میں انگریزی زبان کی تعلیم دورِ حاضرہ کے سائنس کے ساتھ ساتھ لازم تھی لیکن مذہبی مضامین نصاب سے بالکل خارج کر دیئے گئے تھے حالانکہ یہی مضامین پرانے نظامِ تعلیم کی بنیاد و اساس تھے۔ یہ یقیناً بنیادی تغیر تھا اور اس کے اثرات نہایت دور رس ثابت ہوئے۔ یہ پالیسی اختیار کرنے میں برطانوی حکمرانوں کے پیشِ نظر اپنے خاص وجوہ تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان کی تعلیم اس لئے لازم قرار دے دی تھی کہ انہیں انگریزی جاننے والے لوگوں کی بہت بڑی تعداد مطلوب تھی جو نظم و نسق میں ہاتھ بٹائے۔ مذہبی مضامین اور

---

[1] Hartog Committee

مذہبی تعلیم کو خارج رکھنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ حکومت برطانیہ کی غیر جانبدارانہ پالیسی کا طبعی نتیجہ ہے اور اس کے زیر حکمرانی وسیع علاقوں میں بہت سے مذہبوں، ذاتوں اور قوموں کے لوگ آباد ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں پر ایک ایسا نظام تعلیم ٹھونستے وقت شدید بے انصافی کی، جس کی جڑیں قوم کی نفسیات میں موجود نہ تھیں۔ مذہبی غیر جانبداری کے سلسلے میں حکومت کی پالیسی نے تعلیم کے اخلاقی اور مذہبی پہلو کو بالکل خارج کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو اپنی ثقافتی اقدار پر کوئی یقین نہ رہا اور تعلیم یافتہ طبقے دو واضح متخاصم گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ترقی پسند عناصر نے نئی تعلیم کی اہمیت سمجھ لی اور اس کے فوائد کا اندازہ کر لیا۔ جس کے ذریعے سے دور حاضر کے سائنٹیفک علوم اور تکنیک کے دروازے ان پر کھل گئے۔ ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی تھا کہ اس میں ایک اہم پہلو کے لحاظ سے خامی ہے یعنی مذہبی تعلیم ناپید ہے، جس نے پرانے نظام تعلیم کو ایک مطلوب اخلاقی رنگ دے رکھا تھا بلکہ اس میں تقدس پیدا کر دیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں یہ معاملہ بڑا تشویش انگیز تھا۔ مذہبی بنیاد کے بغیر نئی تعلیم سراسر بے روح تھی کیونکہ یہ لادینی تھی اور اس میں بظاہر کوئی اخلاقی بنیاد موجود نہ تھی چنانچہ انہوں نے اس خامی کا، جو ان کے نزدیک واقعی تشویش انگیز تھی تدارک کرنے کے لئے دو تدبیریں اختیار کیں۔

اوّل یہ کہ حتی الامکان انہوں نے پرانی وضع کے "مدرسے" قائم رکھے جن کے نصابِ تعلیم میں مذہبی مضامین کو نمایاں درجہ حاصل تھا۔ حکومت کی طرف سے امداد باقی نہیں رہی تھی اور یہ مدرسے صرف انفرادی کوششوں کی بنا پر جاری رکھے گئے۔ ایسے مدرسے آج بھی پاکستان کے تقریباً ہر ضلع میں موجود ہیں۔ دوسری تدبیر یہ تھی کہ انہوں نے نئے نمونے کے سکول خود جاری کر دیئے جن کی فضا کو یوں اسلامی بنا لینے کی کوشش کی کہ سرکاری سکولوں کے نصاب کے ساتھ مذہبی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔

موجودہ حالت

روایتی طرز کی تعلیم و تدریس ان مدارس میں ہوتی ہے جن کے مصارف افراد اور انجمنوں کے ذریعے سے پورے کئے جاتے ہیں مثلاً ندوۃ العلماء، مدرسۂ عالیہ دیوبند، جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ محمدی جھنگ اور دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار (حیدر آباد سندھ) یہ مدارس اپنے طریق پر نہایت مفید کام انجام دے رہے ہیں لیکن ان کے نصابِ تعلیم میں مذہبی مضامین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور یہ انگریزوں کے دنیوی نظامِ تعلیم کا ایک طبعی ردِ عمل تھا۔ ان مدارس میں عربی زبان و ادب، منطق اور ازمنۂ وسطیٰ کا فلسفہ بھی پڑھایا جاتا ہے چونکہ ان کا تعلیمی نظام ضروریاتِ حاضرہ کے مطابق نہیں رہا۔ اسلئے

یہ قدیم زمانے کی مذہبی درس گاہیں رہ گئی ہیں۔

ایم، اے، او کالج علی گڑھ اور دوسرے ادارے، جو پورے ہندوستان میں اسی نمونے پر قائم کئے گئے۔ ان مصلحتوں کا نتیجہ تھے جن کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔ یہ امر انتہائی افسوس کا باعث ہے کہ تقسیم ملک نے اس ادارے (ایم، اے، او کالج علی گڑھ) پر حد درجہ برا اثر ڈالا جس کی پرورش مسلمانانِ ہند نے خونِ حیات سے کی تھی اور جو اس صدی کے عشرہ ثالثہ میں یونیورسٹی کے درجے پر پہنچا تھا۔

پنجاب میں مسلمانوں کی تعلیم کا بیڑا انجمن حمایت اسلام نے اٹھایا جس کی بنیاد راقم الحروف کے جدِ امجد اور دوسرے پُرجوش و محبِ عوام مسلمانوں نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور رکھی تھی اس انجمن کی ابتدا نہایت معمولی حیثیت میں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ پہلے سال کا پورا خرچ پانسو روپے سے بھی کم تھا لیکن آج یہ انجمن مندرجہ ذیل اداروں کی کفیل ہے۔ ایک اعلےٰ درجے کا مردانہ کالج۔ جو پاکستان میں سب سے بڑا کالج ہے۔ ایک اعلےٰ درجے کا زنانہ کالج، پانچ مردانہ ہائی سکول، ایک زنانہ ہائی سکول (ان تمام اداروں میں مذہبی تعلیم نصاب کا لاینفک جزو ہے) ایک طبیہ کالج جس میں اسلامی نظامِ طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک یتیم خانہ مردانہ اور ایک زنانہ اور ایک وسیع دار الاشاعت، جس کے زیرِ اہتمام ضروری مذہبی کتابوں کے علاوہ

مذہبی قاعدے، ریڈریں اور اسلامی و ثقافتی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں بطور خاص قابل ذکر امر یہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن نے قرآن مجید کے متن کا ایک بیش بہا نسخہ شائع کیا۔ جو صرف حسنِ کتابت ہی کے اعتبار سے ممتاز نہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس کے متن میں کسی بھی قسم کی کوئی غلطی نہیں۔ انجمن کی مختلف سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر طویل فرصت کا متقاضی ہے، محض اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اس انجمن کے مفید کام نے مسلمانوں میں عمل کا گہرا جذبہ پیدا کیا اور انہوں نے چھوٹے پیمانے پر پورے ملک میں ایسی ہی تعلیمی انجمنیں قائم کر لیں۔ انجمن ہی کے سکولوں کا نمونہ پیش نظر رکھتے ہوئے سکول جاری کر دیئے اور آج پاکستان کے تقریباً ہر اہم قصبے میں اسلامیہ سکول موجود ہیں۔

جب پاکستان ایک خود مختار اسلامی مملکت کی حیثیت میں برسر کار آیا تو مختلف انجمنوں کے اسلامیہ سکولوں اور سرکاری سکولوں میں فرق مذہبی تعلیم کے نقطۂ نگاہ سے عملاً ناپید ہو گیا کیونکہ مملکت کے لئے اسلامی اصول کی پابندی لازم تھی۔ سرکاری محکمہ تعلیم نے مستعدی سے کام لے کر تمام سکولوں میں مذہبی تعلیم جاری کر دی اور اس مقصد کے لئے نصاب کی کتابیں بھی مقرر کر دیں۔ ان میں اسلامی عقائد، مذہبی فرائض و معمولات اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے علاوہ قرآن مجید کے بعض حصے — اور

رسولِ اکرم (صلعم) کی احادیث بھی شامل ہیں۔ ابتدائی جماعتوں میں اسلامی مشاہیر کے سوانح حیات کے ذریعے سے کردار کے اعلیٰ نمونوں کی روح پیدا کی جارہی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی نے "اسلامیات" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا ہے جس میں اسلام کا مطالعہ ایک مذہبی نظام کی حیثیت سے کیا جارہا ہے۔ یہ ایک مستقل مضمون ہے جسے طلبہ درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کرنے کیلئے بعض دوسرے مضمونوں کی طرح لے سکتے ہیں کوئی چاہے تو درجۂ اختصاص حاصل کرنے کی غرض سے اسلامیات میں ایم۔ اے کا امتحان بھی دے سکتا ہے اور ڈاکٹر کی ڈگری بھی لے سکتا ہے۔ البتہ دوسرے علوم میں یونیورسٹی کے مقررہ مختلف مدارج کی طرح اسلامیات میں بھی نصاب کا دائرہ اور معیار ہر درجے کے لئے مختلف ہے۔ مقررہ نصاب کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ خالص مذہبی نظام کے پس منظر سے آگاہی کے لئے اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ لازم رکھی گئی ہے۔

اسلامیات میں بی۔ اے کر لینے کے بعد تعلیم کا دائرہ بہت وسیع رکھا گیا ہے۔ یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے عام مذہبی علوم ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ انتظام بھی کر دیا گیا ہے کہ طلبہ اسلامی مملکتوں کی سیاسی تاریخ مسلم اقوام کے ادبیات علوم و فنون کے نشو و ارتقاء اور اسلام میں

فلسفیانہ فکر و نظر کی ترقی سے آگاہ ہوں۔ اس مضمون میں دائرہ دانستہ وسیع رکھا گیا اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایک مذہبی نظام کی حیثیت میں اسلام کا مطالعہ اور حیاتِ انسانیت میں اس کی تہذیبی قوت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم اسلام میں ادبی، علمی، فنی، فلسفیانہ اور ذہنی نشو و ارتقاء کا جائزہ نہ لے لیں اور ان تمام چیزوں میں اسلام کے مقاصد کم و بیش محرک و کار فرما رہے ہیں۔ اسلام کا مطالعہ محض نظری پہلو سے کافی نہیں ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کی زندگی پر حقیقتہً کیا اثر ڈالا اور یہ کام اس وقت تک تسلی بخش طریق پر انجام نہیں پا سکتا جب تک اسلامی ثقافت کے تمام پہلوؤں کا کامل موازنہ نہ کر لیا جائے۔

اسلامی دنیا میں مذہبی تعلیم کی اہمیت

اسلامی تعلیم کا ایک مقصد مذہبی تھا بلکہ کہنا چاہیے یہ سب سے بڑا مقصد تھا۔ "الزرنوجی" نے مذہبی مقصد پر زور دیتے ہوئے کہا ہے "تعلیم کا مقصد باری تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنا اور دائمی زندگی پانا ہے" امام غزالیؒ "فاتحۃ العلوم" میں فرماتے ہیں کہ تعلیم بھی عبادت کا ایک طریقہ ہے اگر اس میں دنیوی تصور پیش نظر رکھا جائے تو اصل مقصد کالعدم ہو جائے گا۔ امام موصوف لکھتے ہیں "جس شخص کا مقصد یہ ہو کہ تعلیم سے روپیہ پیدا کرے

اور بلند مجلسی حیثیت حاصل کرلے یا اس کے محاصل گھٹ جائیں اور سلطان کے تعلق میں واجبات میں پہلو تہی کا موقع پیدا ہو جائے یعنی جو شخص باری تعالیٰ کی عبادت کے سوا تعلیم میں کوئی دوسرا مقصد پیش نظر رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو خوفناک نتائج کا نشانہ بناتا ہے۔" غرض تعلیم میں مذہبی مقصد کو بہت اہم حیثیت حاصل تھی کیونکہ تعلیم کا بہترین وظیفہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ خدا کی عبادت کی جائے اور انسانوں کو سکھایا جائے کہ اس دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے اور آئندہ زندگی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

دورِ حاضر کے تعلیمی نظریے سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ تعلیمی کوشش کا اصل مقصد فرد کو کامل بنانا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب انسان کے نشوونما ارتقا میں ایک بنیادی عامل ہے۔ لہٰذا سکولوں میں مذہبی تعلیم کو نہایت اہم مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ اس سے وہی لوگ اختلاف کر سکتے ہیں جو مذہب کے منکر ہیں اور قوموں کی زندگی میں اسے ایک اہم اور مستقل قدر و قیمت رکھنے والا عامل نہیں سمجھتے۔

کہا گیا ہے کہ اسلامی تعلیم کا مقصد اسلامی اصولِ فرض سکھانا ہے جو پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے بہ الفاظِ دیگر اسلام کے ابتدائی دور میں مذہبی اور دنیوی (سیکولر) تعلیم کے درمیان کوئی واضح خطِ فاصل نہ تھا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیوں کوئی امتیاز ہونا چاہیئے۔

تعلیم کا اسلامی نصب العین

آج تعلیم کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کا مقصد و نظریہ متعین کیا جائے۔ نصف صدی پیشتر ایسے مقصد کے متعلق کوئی شبہ نہ تھا مقصد یہ تھا کہ نوکر شاہی کی مشینری کے لئے پرزے تیار کئے جائیں، اس میں بھی شبہ نہ تھا کہ یہ مقصد کیونکر حاصل کیا جائے گا یعنی طالب علم کو خالص دنیوی ادبی تعلیم دیدی جاتی اب پاکستان قائم ہو چکا ہے اور اس مقصد کی تعریف از سر نو ضروری ہے۔ لازم ہے کہ ہم اپنی پالیسی کی تجدید موجودہ ضرورتوں کے مطابق کریں۔

پاکستان کی پہلی تعلیمی کانفرنس نومبر ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔ اس میں برطانوی نظام تعلیم کے مضر اثرات کا اعتراف کیا گیا جس کے ذریعے سے لوگوں پر حکمرانوں کی ثقافت ٹھونسی گئی اور انہیں مجلسی و اخلاقی اقدار کو رواج دیا گیا جو اسلامی قلب و روح کے لئے اجنبی تھیں۔ اس سے ایک خاص چھوٹا سا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے آپ کو خاص وقار و اقتدار کا حقدار سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ بندی ایک منظم معاشرے کی تخلیق کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی، لہذا کانفرنس نے فیصلہ کر دیا کہ پاکستان کا نظام تعلیم اسلامی نصب العین پر مبنی ہونا چاہیئے۔ بہ الفاظ دیگر کردار کے نشو و ارتقا اور خیر و صلاح کی تربیت پر زور دینا ضروری ہے کیونکہ تعلیم کردار کے بغیر سراپا شر ہے لہٰذا ایسے انسان پیدا کرنے چاہئیں جن کا

احساس یہ ہو کہ وہ ایک عالمی برادری کے ارکان ہیں ان کا فرض ہے کہ اسلامی اصول پر کاربند رہیں۔ اسلامی معیار زندگی قائم رکھیں اور کسی دوسرے نظام عقائد یا مجلسی فلسفے سے انہیں کوئی سروکار نہ ہو۔ جس حد تک پاکستان کا تعلق ہے تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ شہریوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان فوائد کا صحیح شعور پیدا کیا جائے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان فرائض سے باخبر کیا جائے جو ایک آزاد اسلامی ملک کے شہری ہونے کی حیثیت میں ان پر عائد ہیں۔ اگر تعلیم سے مذہب کو الگ رکھا جائے تو کیا مذکورہ بالا مقصد حاصل ہو سکے گا؟

نتیجہ

کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تعلیم اسلام سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ اعتراض فطرتِ اسلام کے غلط تصور پر مبنی ہے اور غالباً اسی وجہ سے بعض اوقات نیک دل افراد بھی اس چیز پر زور دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جسے وہ اسلام کی "تعبیر حاضر" قرار دیتے ہیں۔ حال ہی میں ایک مشہور مستشرق نے جس کے علم و فضل کے لئے راقم الحروف کے دل میں بڑا احترام ہے ایسی ہی ایک تجویز پیش کی تھی۔ اس پر مجھے لارڈ کرومر[1] کا قول یاد آ گیا یعنی "اگر اسلام کو

1ـ Cromer

دورِ حاضر کی تعبیر کے سانچے میں ڈھال لیا جائے تو وہ اسلام نہیں رہے گا"
میں بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ اسلام کو دورِ حاضر کی تعبیر کے مطابق لانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اسلام ہمیشہ کے روزمرہ زندگی کا مذہب ہے اس میں انسان کی پوری تعلیم شامل ہے، بدقسمتی سے مغربی فکر و نظر کے زیرِ اثر بعض حلقے سمجھ رہے ہیں کہ اسلام زندگی کے دھارے سے کوئی الگ شے ہے اور اس پر جداگانہ بحث کرنی چاہیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ نظام میں مذہبی تعلیم کو عام تعلیم سے بالکل الگ چیز قرار دیا گیا۔ یہ فکر سراسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دینی اور دنیوی تعلیم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ مذہب کو پھر زندہ کیا جائے اور اس کی صورت یہی ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کو اسلامی بنایا جائے۔

مذکورہ بالا اعتراض دورِ حاضر کی سائنٹیفک تعلیم کی حقیقی نوعیت کے متعلق بھی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ سائنٹیفک تعلیم مسیحی دنیا کی پیداوار نہیں بلکہ اسلام کے عہدِ روشن کی میراث ہے۔ مسلمان حکماء نے سب سے پہلے استقرائی طریقِ استدلال اختیار کیا اور اسے فروغ دیا۔ اس کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ قرآن مجید نے ہمیں سکھایا۔ قرآن مجید ہی نے آزاد فکر و نظر کی حوصلہ افزائی کی اور بار بار مسلمانوں کو تلقین فرمائی کہ وہ "تدبر" و "تفقہ" سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں

جو قلب عطا کیا ہے اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ یہی وجہ ہے
کہ اسلام میں سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی کش مکش نہیں۔ اسلام
کے عہدِ عروج و جلال میں بھی ایسی کوئی کشمکش موجود نہ تھی جب سائنس
کے لیے سرگرمی ایک مذہبی فریضہ سمجھی جاتی تھی اور کوئی وجہ نہیں
کہ آج یہ کش مکش پیدا ہو۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیمی مقاصد کی
وہ وحدت بحال کی جائے جو پہلے موجود تھی۔ مذہب کو بجا طور پر
"معاشرے کا سیمنٹ" قرار دیا گیا ہے۔ یہ ثقافتی انقلاب کے لئے
ناگزیر ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ۱۹۲۲ء میں رکھی گئی، برصغیر پاک و ہند کے اس خطۂ ارض میں جسے اب تاریخ نے سرزمین پاکستان کا نام دیا ہے خلیفہ شجاع الدین جو اس تنظیم کے روحِ رواں تھے اس کے اولین سیکرٹری منتخب ہوئے اور مقتدر مسلم زعما علامہ اقبالؒ، میاں سر فضل حسین، سر عبدالقادر، میاں سر محمد شفیع، سر شہاب الدین اور چوہدری نذیر احمد خاں۔ اس کے ساتھ مختلف ادوار میں منسلک رہے آزادی سے قبل تعلیمی میدان میں اس نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں اور علاوہ دیگر امور کے نادار مسلم طلباء کو تعلیم جاری رکھنے کے لئے مالی وسائل مہیا کئے۔

بانی کانفرنس کی وفات کے بعد چند سال کانفرنس کا کام معطل رہا مگر ۱۹۵۹ء میں خلیفہ صاحب مرحوم کے پرانے رفقاء کی اعانت سے کانفرنس کا کام از سر نو شروع کر دیا گیا۔ نئی تنظیم کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس طے پایا۔ جسٹس سجاد احمد جان جج ہائی کورٹ اس کے صدر منتخب ہوئے اور شیخ مقبول احمد ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج اس کے نائب صدر۔ کانفرنس کے پیش نظر یہ مقاصد ہیں۔

(الف) طریقۂ تعلیم و نصابِ تعلیم کا قوم کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی روشنی میں جائزہ لیتے رہنا۔

(ب) پہلے سے موجود تعلیمی اداروں کے تعاون سے تعلیم کو ترقی دینا۔

(ج) نئے تعلیمی ادارے قائم کرنا۔

(د) ذہین مگر مستحق طلباء کو مالی امداد بہم پہنچانا۔

(ھ) تعلیمی اداروں اور صنعتی و تجارتی اداروں کے درمیان رابطہ قائم کرنا۔

(و) تعلیم بالغاں کو فروغ دینا۔

(ز) ملک کی تعلیمی، معاشرتی اور تجارتی ترقی کے لئے ہر قسم کی ممکنہ مساعی سے کام لیکر مفید کتب و رسائل کو شائع کر کے عوام میں تقسیم کرنا

ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے کانفرنس سرگرم عمل ہے سال بسال نادار طلباء کے وظائف میں خازن کانفرنس چوہدری نذر محمد کی اعانت سے معتدبہ اضافہ کیا جا رہا ہے اور سال رواں میں پندرہ ہزار روپے کے وظائف دیئے گئے ہیں۔ سالہائے گذشتہ میں مختلف علمی مذاکروں کا اہتمام کیا گیا۔ جن میں نامور ماہرین تعلیم نے ملک کے اہم تعلیمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا علاوہ ازیں ایک لیکچر سیریز کا سلسلہ جاری کیا ہے جسے بانی کانفرنس کی یادگار کے طور پر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین لیکچرز، کا نام دیا گیا ہے اور ہر سال ملک کی ممتاز شخصیتوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مختلف اہم مضامین پر مقالے پڑھیں یا تقریریں کریں۔

کانفرنس کے اشاعتی پروگرام کے تحت ہمارے تعلیمی مسائل کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا جا چکا ہے جس میں ان تمام مقالات کو شامل کیا گیا تھا جو مشہور ماہرین تعلیم نے کانفرنس کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرہ میں پڑھے۔ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی یہ کتاب ہے جو خلیفہ صاحب مرحوم کے خطبات پر مشتمل ہے۔

کانفرنس کے پیش نظر ایک ایسی نمونہ کی درس گاہ کا قیام ہے جو اسلام کی بنیاد پر دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہوگی۔ اس مدرسہ

کے لئے محکمہ اوقاف نے کانفرنس کو باغ جناح کے سامنے ایک خطہ زمین دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور دیگر تفصیلات طے ہو جانے پر اس منصوبہ کو عملی شکل دی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز

اسلام کیا ہے؟ ٭ قرآن کیا ہے؟ ٭ حضور سرور کائنات کا مقام کیا ہے؟

یہی تین چیزیں ہمارے دین کی بنیاد ہیں اور انہیں تین سوالوں کے صحیح جواب ہماری دینی و دنیوی فلاح کے ضامن ہیں

اسلامی تعلیمات

مولفہ:— مرزا عبدالحمید ایم۔اے

میں انہیں تین بنیادی سوالات کے صحیح جوابات دیئے گئے ہیں۔ ساری کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرآن مجید کو سمجھنے کے اصول، قرآن مجید کے کمالات اور قرآن مجید کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدس کے ایک ایک پہلو پر بالتفصیل روشنی ڈالی گئی ہے اور تیسرے باب میں ارکان عبادت اور ان کے فلسفے پر بحث کی گئی ہے۔

اسلامی تعلیمات

اسلامیات پر وہ معرکہ الآرا کتاب ہے جو پڑھنے والے کے سامنے اسلام کی صحیح اور مکمل تصویر کھینچ دیتی ہے اور جس کے مطالعے سے تمام شکوک و شبہات دور ہو کر دین حق دل راسخ ہو جاتا ہے۔

ضخامت ۵۶۰ صفحات

قیمت ۵ روپے

ناشران

ملک سراج الدین اینڈ سنز۔ پبلشرز۔ کشمیری بازار لاہور (۹)

(حمایت اسلام پریس لاہور)